# فہرست


| | | | |
|---|---|---|---|
| **حرف اوّل** | ابتدا تیرے نام سے | صائمہ اسما | 5 |
| **انوار ربانی** | دعا | ڈاکٹر مقبول احمد شاہد | 7 |
| **قولِ نبیؐ** | دنیا ایک سرائے | افشاں نوید | 10 |
| **خاص مضمون** | مریم جمیلہ | فرزانہ چیمہ | 13 |
| | میری والدہ | ماریہ خانم | 24 |
| **حالاتِ حاضرہ** | مسلمان عورت مظلوم نہیں | ترجمہ: عائشہ عثمان | 29 |
| **نوائے شوق** | حمد | عنایت علی خان | 31 |
| | اپنی لختِ جگر کی یاد میں | شاہدہ سحر | 31 |
| | گھر کیسے تقسیم ہوا | شمیم فاطمہ | 32 |
| | دشتِ کربلا سے | شمیم فاطمہ | 33 |
| **حقیقت وافسانہ** | مسجد کی سیڑھیاں | عالیہ حمید | 35 |
| | آنگن | حمیرا خالد | 45 |
| | کہیں چاند راہوں میں کھو گیا | نصرت یوسف | 49 |
| **نمایاں خواتین کا تذکرہ** | ام جمیل زوجہ ابولہب | آسیہ راشد | 57 |
| **ہلکا پھلکا** | چلتے چلتے | فرزانہ چیمہ | 60 |
| **سفرِ سعادت** | وقت حضوری | قانتہ رابعہ | 63 |
| **خفگانِ خاک** | میری آپی | کوثر مسعود | 66 |
| **مطالعہ گاہ** | میری لائبریری سے | ڈاکٹر آسیہ شبیر | 68 |
| **غذا و صحت** | خشک میوہ جات | آسیہ راشد | 70 |
| **گھرداری** | بچوں کو سردی سے بچائیں | آسیہ راشد | 72 |
| **محشرِ خیال** | عنایت علی خان، شاہدہ اکرام، فرزانہ چیمہ، اسامہ ربانی | | 74 |
| **گوشۂ تسنیم** | شاپنگ لسٹ | ڈاکٹر بشریٰ تسنیم | 79 |

# ابتدا تیرے نام سے

محترم قارئین! سال کا آخری مہینہ پھر آ لگا۔ وقت کی یہ خوبی ہے کہ جیسا بھی ہو گزرتا رہتا ہے۔ بنت الاسلام صاحبہ کی بات یاد آتی ہے کہ برا وقت آئے تو یہ سوچ کر خود کو تسلی دو کہ اسے ہمیشہ نہیں رہنا آخر کار گزر جانا ہے۔ اور اچھے وقت کا گزرنا تو کبھی پتہ چلتا ہی نہیں۔

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اُڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں (اقبال)

محرم الحرام حسینی قافلے کے کلمۂ حق اور عزم و استقلال کی یاد دہانی کرواتا گزر رہا ہے۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ فرما گئے ہیں:

سرداد نہ داد دست در دستِ یزید
حقّا کہ بنائے لاالٰہ است حسینؓ

اگر بنائے لاالٰہ، اللہ کی زمین سے ظلم و جبر کا خاتمہ ہے، انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلا کر اللہ کی غلامی میں لانا ہے اور اس راہ میں آنے والی رکاوٹوں کا ڈٹ کا مقابلہ کرنا ہے تو کربلا کا سبق اس کے سوا اور کیا ہے! ازل سے جاری حق و باطل کی جنگ میں اپنا پورا وزن حق کے پلڑے میں ڈال دینا اور ہر خوف و ترغیب سے بے نیاز ہو جانا۔

بقول مولانا محمد علی جوہر:

حق و باطل کی ہے پیکار ہمیشہ جاری
جو نہ باطل سے ڈریں ہیں وہی شیعانِ حسینؓ

یہی وجہ ہے کہ حسینؓ ابن علیؓ کا کردار اس دنیا کے ہر باضمیر شخص کے لیے ایک رہنما کردار کا کام دیتا ہے۔ حسنؓ و حسینؓ محبوبِ خدا ﷺ کے محبوب اور نوجوانانِ جنت کے سردار ہیں۔ مگر اس دنیا نے بھی ان کی عظمت کو تسلیم کیا ہے۔

گنیز بک کے مطابق حسینؓ ابن علیؓ دنیا کی تمام زبانوں میں شاعری کا سب سے بڑا موضوع بننے والی تاریخی شخصیت ہیں۔

مہاتما گاندھی نے کہا تھا:

''میں نے حسینؓ سے یہ سیکھا کہ مظلوم ہوتے ہوئے کیسے فتح یاب ہوا جاتا ہے۔ میرا ماننا ہے کہ اسلام کا پھیلاؤ تلوار سے نہیں حسینؓ کی عظیم قربانی سے ہوا ہے۔''

مشہور تاریخ دان تھامس کارلائل لکھتا ہے:

''سانحہ کربلا سے ملنے والا بہترین سبق یہ ہے کہ حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کا خدا پر بے حد پختہ ایمان تھا۔ انہوں نے دکھایا کہ معرکۂ حق و باطل میں عددی برتری کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ کم ہونے کے باوجود قافلہ حسینؓ کی فتح حیران کر دیتی ہے۔''

انگریزی ناول نگار چارلس ڈِکنز کا کہنا تھا:

''اگر حسینؓ دنیاوی فائدوں کے لیے لڑے ہوتے تو ان کی بہن، بیوی اور بچوں کا ان کے ساتھ ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔ عقل کو ماننا پڑتا ہے کہ ان کی قربانی خالصتاً اسلام کے لیے تھی۔''

خلافت کے بے مثال راستے کو ملوکیت اور آمریت میں بدلتے ہوئے دیکھ کر اٹھ کھڑے ہونے اور اپنا خانوادہ قربان کر دینے والی اس عظیم شخصیت کا کردار پوری امت کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ بقول شاعر:

یہ سلسلہ نہیں محدود کربلا تک ہی
لہو تو آج بھی درکار ہے زمینوں کو

آج عرب ممالک میں آمریت کے خلاف بیداری کی لہر حسینی قافلے سے نسبت کی بجا طور پر حقدار ہے۔ دیگر بہت سے مسلمان ممالک بشمول پاکستان، جہاں حکومتوں اور عوامی امنگوں کے دھارے دو مختلف سمتوں میں بہتے ہیں، اپنی اپنی کربلاؤں میں گھرے، اپنے اپنے فرات کے کنارے تا حال منتظر ہیں۔

غزہ ایک بار پھر معصوموں کے خون سے نہا گیا۔ اسرائیل اپنی ازلی درندگی اور سفّاکی کو من گھڑت جواز پہناتا رہا۔ ضمیرِ عالم سویا رہا۔ ڈی ایٹ اور او آئی سی بھی ریت کے ڈھیر بنے رہے اور نہتے بے بس شہریوں پر میزائل گرتے رہے۔ پورے پورے کنبے ختم ہو گئے۔ آخر کار مصر کے صدر مرسی کی مداخلت سے مفاہمت اور جنگ بندی ممکن ہوئی۔ مگر بحیثیت مجموعی مسلمان ممالک کا کردار فلسطین کے معاملے میں حسبِ سابق انتہائی مجرمانہ رہا۔

محرم الحرام کا آغاز ہوتے ہی وطنِ عزیز ایک بار پھر دھماکوں سے گونجنے لگا۔ بے شمار جانیں ضائع ہوئیں۔ دہشت گردی کی کچھ کوششیں ناکام بھی بنائی گئیں مگر کراچی، کوئٹہ، ڈی آئی خان اور دیگر شہروں میں بحیثیت مجموعی بدامنی رہی۔ یہ سب ریڈ الرٹ سیکیورٹی کی حالت میں ہوا۔ کیا حکومت کی یہی رِٹ قائم کرنے کے لیے قبائلی علاقوں میں فوجی آپریشن کا جواز دیا جاتا ہے؟

محترم قاضی حسین احمد پر بھی قاتلانہ حملے کی کوشش ہوئی جس کا الزام انہوں نے امریکہ اور اسرائیل کے ایجنٹوں کو دیا جو اتحاد اور یک جہتی کی کوششوں کو کسی صورت کامیاب نہیں ہونے دینا چاہتے۔

ممتاز نومسلم سکالر مریم جمیلہ خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ مغرب سے ہجرت کر کے پاکستان آنے والی یہ خاتون ایک سچی اور باعمل مسلمان تھیں۔ ایک بھرے پُرے خاندان میں گھریلو زندگی بسر کی، مِل جُل کر رہیں اور ایک مطمئن زندگی گزاری۔ کئی قابلِ قدر کتب اور مقالات تحریر کیے۔ اسلام کو مسلمانوں سے زیادہ اچھا سمجھا اور اپنایا۔

اللہ تعالیٰ ان کی مساعیِ جمیلہ کو قبول فرمائے آمین۔ ان کے بارے میں مضامین اس شمارے کا حصہ بھی ہیں اور انشاءاللہ اگلے شمارے میں بھی شامل ہوں گے۔

دعا گو

صائمہ اسما

# دعا

## دعا کے آداب

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اپنے رب کو پکارو تضرع کے ساتھ (گڑگڑاتے ہوئے) اور خفیہ طریقے سے (چپکے چپکے)، یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ زمین میں فساد برپا نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے اور خدا ہی کو پکارو خوف کے ساتھ اور طمع کے ساتھ، یقیناً اللہ کی رحمت محسنوں کے قریب ہے۔'' (الاعراف ۵۵-۵۶)

''اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کو صبح شام یاد کیا کرو دل ہی دل میں زاری (تضرع) اور خوف (خیفہ) کے ساتھ، اور زبان سے بھی ہلکی آواز کے ساتھ، تم ان لوگوں میں سے نہیں ہو جاؤ جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔'' (الاعراف ۲۰۵)

''پس ہم نے زکریاؑ کی دعا قبول کی اور اسے یحییٰ عطا کیا، اور اس کی بیوی کو اس کے لیے درست کر دیا۔ یہ لوگ نیکی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے تھے اور ہمیں رغبت اور خوف کے ساتھ پکارتے تھے، اور ہمارے آگے خشوع کرنے والے تھے۔'' (الانبیاء ۹۰)

تضرع اور خشوع میں یہ بات شامل ہے کہ دعا کے وقت انسان اپنے رب کے سامنے اپنی عاجزی وانکساری، ذلت و پستی، اور بے بسی کا اظہار کرے۔ اس کے لہجے میں منت و سماجت کا غلبہ ہو، مطالبے کا انداز نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ سے مطالبہ نہیں کیا جا سکتا، مانگا جا سکتا ہے۔ تضرع کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان جو دعا اپنی زبان سے ادا کر رہا ہے اس کا مطلب سمجھتا ہو۔ دعا پڑھنے کی چیز نہیں، مانگنے کی چیز ہے۔

خفیہ کا مطلب ہے آہستہ آواز سے کہ دوسروں کو سنائی نہ دے۔ جیسے حضرت زکریاؑ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ۔'اذ نادیٰ ربہ نداء خفیّا ' (مریم ۳) جب اس نے اپنے رب کو چپکے چپکے پکارا۔ غزوۂ خیبر کے موقع پر کچھ صحابہ کرام دعا مانگ رہے تھے تو ان کی آوازیں بلند ہو گئیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''کہ پست آواز سے دعا مانگو تم کسی بہرے یا غائب ہستی کو نہیں پکار رہے ہو، بلکہ تم ایک سمیع اور بصیر ذات کو پکار رہے ہو۔'' (بخاری، مسلم)

یہی بات سورۃ البقرہ آیت ۱۸۶ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''جب میرے بندے میرے بارے میں پوچھیں تو ان سے کہو کہ میں ان کے قریب ہی ہوں۔''

آہستہ آہستہ اللہ کو پکارنے کا حکم انفرادی طور پر دعا مانگنے سے متعلق ہے۔لیکن اجتماعی طور پر دعا مانگنے میں اس بات میں کوئی ہرج نہیں اگر ایک شخص بلند آواز سے دعا مانگے اور باقی لوگ اس پر آمین کہتے جائیں۔ جیسے کہ نماز استسقاء اور فرض نماز کے بعد مسجدوں میں دعا کی جاتی ہے۔ اسی طرح حج کے موقعہ پر سب حاجیوں کو تلبیہ (لبیک اللھم لبیک ..... ) بلند آواز سے کہنے کا حکم ہے، اس میں یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ اس سے اللہ کے دین کا رعب اور دبدبہ قائم ہوتا ہے۔

دعا میں خیفہ یعنی خوف کا عنصر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اپنی کم مائیگی کا خوف رہے، اپنے گناہوں کے برے نتائج کا خوف رہے۔ اللہ تعالیٰ کے غضب کا ڈر اس کے دل میں ہو، اور اس بات کا اندیشہ کہ میری دعا کہیں رد نہ کر دی جائے۔لیکن خوف اس حد تک نہ ہو کہ انسان اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جائے۔ یہی شیطان کا مقصد ہوتا ہے اس لیے فرمایا :' لا تقنطوا من رحمة اللّٰہ '.....''اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔'' (سورۃ الزمر۵۳)

اللہ کے خوف سے آنکھوں سے آنسو بہہ نکلنا دعا مانگنے والے کے خلوص کی علامت ہے، اور ایک پسندیدہ فعل ہے۔

- عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، خدا کا کوئی مومن بندہ ایسا نہیں جس کی آنکھوں سے خوف خدا میں آنسو نکلیں، اگر چہ وہ آنسو مکھی کے سر کے برابر ہوں پھر وہ آنسو اس کے خوبصورت چہرے پر پہنچیں مگر یہ کہ اللہ اس پر دوزخ کی آگ کو حرام کر دیتا ہے۔ (مشکوٰۃ)

طمع اور رغبت کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ سے اپنی دعا قبول ہونے کی امید۔لیکن یہ امید ایسی بھی نہ ہو کہ بندہ یہ کہے کہ بس میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگ لی ہے اور اب اللہ پر لازم ہے کہ میری دعا قبول کر لے، امید کے ساتھ خوف کی کیفیت موجود رہنی چاہیے۔ جب انسان صحت مند ہو تو خوف کی کیفیت غالب رہنی چاہیے تا کہ انسان گناہوں سے بچا رہے۔ اور جب زندگی کی مہلت ختم ہو رہی ہو تو امید کا پہلو غالب رہنا چاہیے کہ اللہ غفور و رحیم ہے۔

''اللہ کی رحمت نیکوکاروں کے قریب ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ دعا کی قبولیت کے لیے نیکوکار ہونا ضروری ہے۔ اگر اس سے پہلے گنہگار رہا ہو تو اللہ سے توبہ کر کے نیکوکاروں (محسنین) میں شامل ہو جائے، اپنے گناہوں پر اصرار نہ کرے۔

## دعا کا طریقہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں دعا مانگنے کا جو طریقہ سکھایا ہے اس میں ترتیب اس طرح ہے:

اللہ کی حمد، نبی کریمؐ پر درود، دعا، پھر درود اور آخر میں

آمین۔

✎ فضالہ بن عبیدؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو سنا، اس نے نماز میں دعا کی، جس میں نہ اللہ کی حمد کی، نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا، تو حضورؐ نے فرمایا۔ اس شخص نے دعا میں جلد بازی کی، پھر آپ نے اس کو بلایا اور اس سے یا اس کی موجودگی میں دوسرے آدمی کو مخاطب کر کے آپ نے فرمایا:

جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو (دعا کرنے سے پہلے) اس کو چاہیے کہ اللہ کی حمد وثنا بیان کرے، پھر اس کے رسولؐ پر درود بھیجے، اس کے بعد جو چاہے اللہ سے مانگے۔ (ترمذی)

✎ ایک اور موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر دعا معلق رہتی ہے جب تک کہ دعا کے ساتھ (اول و آخر) حضورؐ پر صلوٰۃ وسلام نہ بھیجا جائے۔ (صحیح الجامع)

✎ ابوزہیر نمیریؓ سے روایت ہے کہ ایک رات ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باہر نکلے، ہمارا گزر اللہ کے ایک بندے پر ہوا جو بڑے الحاح سے اللہ سے مانگ رہا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر اس کی دعا سننے لگے، پھر آپؐ نے ہم لوگوں سے فرمایا: اگر اس نے دعا کا خاتمہ صحیح کیا اور مہر ٹھیک لگائی تو جو اس نے مانگا ہے اس کا فیصلہ کرا لیا۔ ہم میں سے ایک نے پوچھا۔ حضورؐ صحیح خاتمہ اور ٹھیک مہر لگانے کا طریقہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا آخر میں آمین کہہ کر دعا ختم کرے۔ (سنن ابی داؤد)

✎ حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب پڑھنے والا (یعنی امام) آمین کہے تو تم بھی آمین کہو، کیونکہ فرشتے بھی آمین کہتے ہیں۔ پھر جس کا آمین کہنا فرشتوں کے آمین کہنے کے موافق ہو جائے، اس کے تمام گزشتہ گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ (بخاری)

✎ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ سے اس طرح ہاتھ اٹھا کر مانگا کرو کہ ہتھیلیوں کا رخ تمھارے سامنے ہو۔ ہاتھ الٹے کر کے نہ مانگا کرو اور جب دعا کر چکو تو اٹھے ہوئے ہاتھ چہرے پر پھیر لو۔ (سنن ابی داؤد)

## دوسروں سے پہلے اپنے لیے دعا کرنا

✎ حضرت ابی بن کعبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کو یاد فرماتے، اور کسی کے لیے دعا کرنا چاہتے تو پہلے اپنے لیے مانگتے، پھر اس شخص کے لیے دعا فرماتے۔ (جامع ترمذی)

اپنے اس عمل سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کا اظہار کرنا چاہتے تھے کہ میں بھی اللہ کا بندہ ہوں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ویسا ہی محتاج اور ضرورت مند ہوں جیسے اور سب لوگ ہیں۔

## تین بار دعا مانگنا

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنے رب سے سوال کرتے یا دعا مانگتے تو تین تین بار دہرایا کرتے تھے۔ (متفق علیہ)

## باوضو اور قبلہ رخ ہو کر دعا مانگنے کا حکم

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا رخ مبارک قبلہ کی طرف پھیرا اور فرمایا: اے اللہ! قبیلہ دوس کو ہدایت دے۔ (متفق علیہ)

حضرت موسیٰ اشعریؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ابو عامرؓ کی دعا کی درخواست پہنچائی گئی جو غزوہ اوطاس میں شہید ہو گئے تھے تو آپ نے پانی طلب کیا وضو فرمایا اور ان کے لیے دعا فرمائی۔ (متفق علیہ)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ باوضو اور قبلہ رخ ہو کر دعا مانگنا افضل ہے ورنہ انسان ہر حال میں اپنے رب کو مخاطب ہو کر دعا کر سکتا ہے لیکن بیت الخلا اور جنابت کی حالت میں نہیں۔ (جاری ہے)

☆☆☆

افشاں نوید

# دنیا ایک سرائے

ابوعسیبؓ نے بیان کیا کہ رسول ﷺ ایک رات گھر سے باہر نکلے اور میرے پاس سے گزرے تو مجھے اپنی طرف بلایا میں بھی نکل کھڑا ہوا۔ اتنے میں ابوبکرؓ کے پاس سے گزر ہوا تو انہیں بھی رسول ﷺ نے اپنی طرف بلایا وہ بھی آ گئے۔ پھر عمرؓ کو بلایا تو وہ بھی ساتھ ہو لئے۔ پھر آپؐ چلتے رہے حتیٰ کہ ایک انصاری کے باغ میں داخل ہوئے اور حضورؐ نے باغ کے مالک سے فرمایا: ''ہمیں گدری کھجوریں کھلاؤ'' مگر اس نے کھجوروں کا گچھا خدمت اقدس میں پیش کر دیا۔ میزبان نے خود بھی کھایا اور رسولؐ اور آپؐ کے اصحابؓ نے بھی نوش فرمایا۔ پھر فرمایا ''قیامت کے روز تم سے ان چیزوں کے بارے میں پُرسش ہوگی'' یہ سن کر حضرت عمرؓ نے وہ گچھا زمین پر ایسے مارا کہ کھجوریں رسولؐ کے سامنے بکھر گئیں اور عرض کیا ''یا رسولؐ قیامت کے روز کیا ہم سے اس کے بارے میں بھی سوال کیا جائے گا؟''

آپؐ نے فرمایا ''ہاں ایسا ہی ہوگا مگر تین چیزیں مستثنیٰ ہیں۔ ایک کپڑے کا وہ ٹکڑا جو انسان کے قابلِ ستر حصوں کے لئے کافی ہو۔ دوسرا غذا کا وہ ٹکڑا جس سے بھوک کا در بند کیا جا سکتا ہو۔ تیسرا وہ مختصر مکان جس میں سردی اور گرمی سے بچاؤ کی خاطر داخل ہو سکیں''

(مسند احمد جلد 5 صفحہ 81 روایت ابوعسیب)

ابوعسیبؓ کی بیان کردہ اس حدیث کی روشنی میں ہم اپنے انفرادی اور اجتماعی خدوخال کا جائزہ لیں تو یہ روح فرسا حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہم بہت کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوجود تعلیمات نبویؐ سے کتنا دور ہو گئے ہیں اور دنیا اور دنیا کی لذتیں ہمیں بھی دنیا پرستوں کی طرح مرغوب ہو گئی ہیں اور ہمارا معاشرہ اور خاندانی نظام جس بھونچال کی زد میں ہے اسکی بہت بڑی وجہ ہمارے اندر قناعت پسندی کا نہ ہونا ہے اور دنیا کی بڑھتی ہوئی طلب ہے۔ جبکہ تعلیمات نبویؐ ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ تھوڑی سی چیز جو ضرورت کیلئے کافی ہو بہتر ہے اس زیادہ چیز سے جو غافل کر دینے والی ہو۔ صرف اپنے گھر اور گھر میں موجود لوازمات پر ہم نظر ڈالیں یا اپنے دسترخوان پر بیٹھ کر سوچیں کہ کتنی مرتبہ ہمیں یہ خیال گزرتا ہے کہ ان نعمتوں کی باز پرس ہونی ہے۔ کھجور اور پانی ہمیں دستیاب نعمتوں کے مقابلے میں کتنی ادنیٰ نعمتیں ہیں جن کے لئے اللہ کے نبیؐ بار بار اصحابؓ کو متوجہ کرتے تھے کہ ان کا بھی حساب ہونا ہے اور ان کا مقصد وہ ذہن تیار کرنا تھا جو دنیا پرست نہ ہو، لالچی اور خودغرض نہ ہو۔ دنیا کمانے کی دھن کو ترجیح اول بنانا جس کی زندگی کا مقصد نہ بن جائے بلکہ اس کو کم سے کم متاع دنیا پر بھی ذہنی آسودگی حاصل رہے اور یہ اطمینان قلب اس کی فکر آخرت کو زندہ رکھے کہ جو کچھ میرے پاس ہے اس کا حساب دینا ہوگا اور جو کچھ

لوگوں کے پاس ہے اس کی طرف وہ للچائی ہوئی حریص نظروں سے نہ دیکھے۔ یہ فکری سطح ایک مومن کو بہت باوقار اور پرسکون معیار زندگی کی طرف لاتی ہے جس میں کسی احساس کمتری وبرتری کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا ''قیامت کے روز بندے سے سب سے پہلے جس نعمت کے بارے میں سوال ہوگا وہ یہ ہیں۔ اس سے پوچھا جائے گا کہ ہم نے تجھے جسمانی صحت سے نہیں نوازا تھا اور پینے کیلئے ٹھنڈا پانی نہیں دیا تھا'' (ترمذی ابواب التفسیر سورۃ التکاثر)

ایک بیمار آدمی سے بہتر صحت کی نعمت کی قدر کون جان سکتا ہے اور دنیا کی ساری لذتوں کا حسن ہی صحت کے ساتھ مشروط ہے اور صحت کے حصول کے لئے انسان بڑی سے بڑی قربانی دینے سے گریز نہیں کرتا چاہے وہ مالی قربانی ہو یا طویل سفر کی مشقت۔ لیکن ایک صحت مند آدمی بیماری سے قبل اپنی صحت کو نعمت عظمیٰ نہیں شمار کرتا، اور دنیاوی اسباب کی کمی پر ہی شکوے شکایات اس کی سوچوں کا مرکز بن جاتے ہیں۔ آپؐ کی دعاؤں میں ہمیں کئی جگہ قناعت کی دعائیں ملتی ہیں۔ اور آپؐ اللہ سے اس کے دیئے ہوئے رزق پر راضی رہنے کی دعا کرتے تھے۔ جبکہ آپؐ کا طرزِ بود و باش انتہائی سادہ اور عاجزانہ تھا، جبکہ ہم بہت پرتعیش زندگی گزارنے کے باجود ان قناعت کی دعاؤں سے بھی بے نیاز نظر آتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ یہ کہ بے شمار نعمتیں رکھنے کے باوجود ہمیں دل کی تونگری حاصل نہیں ہے کیونکہ ہم قناعت سے عملی وفکری طور پر خاصے دور ہو گئے ہیں۔

عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسولؐ نے فرمایا ''اس شخص نے فلاح حاصل کر لی جس نے اسلام قبول کیا اور بقدر ضرورت وکفایت رزق دیا گیا اور خدا نے اس کو اس چیز پر جو اس کو دی گئی ہے قناعت بخشی'' (مسلم)

عمر بن عوفؓ کہتے ہیں کہ رسولؐ نے فرمایا ''خدا کی قسم میں تمہارے فقر وافلاس سے نہیں ڈرتا بلکہ اس سے ڈرتا ہوں کہ دنیا تم پر کشادہ کی جائے گی جس طرح ان لوگوں پر کشادہ کی گئی تھی جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ پھر تم دنیا کی رغبت کرو گے جس طرح تم سے پہلے لوگوں نے رغبت کی اور یہ دنیا تم کو ہلاک کر دے گی جس طرح ان کو ہلاک کیا'' (بخاری ومسلم)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسولؐ نے فرمایا کہ کون ہے جو مجھ سے ان احکام کو لے جائے اور ان پر عمل کرے یا اس شخص کو سکھائے جو اس پر عمل کرے، میں نے عرض کیا یارسولؐ اللہ میں ہوں۔ آپؐ نے میرا ہاتھ پکڑا اور اس طرح پانچ باتیں گنائیں۔

۱۔ ان چیزوں سے اپنے آپ کو بچا جنہیں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اگر تو ایسا کرے گا تو تیرا شمار بہترین عبادت گزار لوگوں میں ہوگا۔

۲۔ جو چیز اللہ نے تری قسمت میں لکھ دی ہے اس پر راضی اور شاکر رہ، اگر تو ایسا کرے گا تو دنیا کے غنی ترین لوگوں میں تیرا شمار ہوگا۔

۳۔ اپنے ہمسائے سے اچھا سلوک کر، اگر تو ایسا کرے

گا تو مومن کامل ہوگا۔

۴۔ جو چیز تو اپنے لئے پسند کرتا ہے دوسرے کیلئے بھی پسند کر، اگر ایسا کرے گا تو کامل انسان ہوگا۔

۵۔ زیادہ نہ ہنس، اس لئے کہ زیادہ ہنسنا دل کو مردہ کر دیتا ہے۔

(احمد۔ترمذی)

آج جس کرپشن نے معاشرے کو گھُن کی طرح چاٹ لیا ہے اگر تعلیمات نبویؐ میں سے ہم ''قناعت'' ہی کی تعلیم پر عمل پیرا ہوتے تو سماج کی تصویر بالکل مختلف ہوتی۔ ہم دنیا کو منتہا سمجھ کر حدود الٰہی کو پامال نہ کرتے بلکہ فکر آخرت ہمیں دل کا غنا عطا کرتی۔ جیسا ہمیں اصحاب رسولؐ کی زندگیوں میں نظر آتا ہے۔

حضرت سلیمان فارسیؓ کا شمار کبار صحابہؓ میں ہوتا ہے یہ بات انکی عظمت کا اندازہ لگانے کے لئے کافی ہے کہ آپ پر شدید گریہ طاری ہوگیا۔ آپ سے اس کیفیت کی وجہ دریافت کی گئی تو آپ نے فرمایا'' مجھے خدشہ ہے کہ میں نے نبی کریمؐ کی اس وصیت کی حفاظت نہیں کی کہ تمہیں مسافر کے زادراہ کی مانند دنیا سے اپنا حصہ وصول کرنا چاہیے جو صرف اپنی انتہائی ضرورت کی چیزیں ہی اپنے ساتھ لیکر جاتا ہے'' اور جب سلمان فارسیؓ کی وفات کے بعد لوگوں نے ان کے ترکے کا جائزہ لیا جس کی جوابدہی کے تصور سے وہ رو رو کر ہلکان ہوئے جارہے تھے تو ان کی چھوڑی ہوئی اشیاء کی کل قیمت 30 درہم بھی نہیں بنتی تھی۔

اللہ کے نبیؐ اپنے اصحابؓ کو بار بار نصیحت فرماتے تھے کہ دنیا میں مسافر کی طرح رہو۔ یہ اس نصیحت کا عملی نمونہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ہم کسی کے بہت پر تکلف گھر میں جاتے ہیں تو ہم کسی نہ کسی درجہ میں مرعوبیت کا شکار ہوئے بغیر نہیں رہتے لیکن اگر ہمیں کسی ریسٹ ہاؤس یا مہمان خانے میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا ہو تو بہت مزین مہمان خانہ بھی اس درجہ میں توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے اور ہم خاص دلچسپی ظاہر نہیں کرتے کیونکہ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ سرائے ہے یہ گزرگاہ ہے یہ کسی کا گھر یعنی مستقل جائے قیام نہیں ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس پوری دنیا میں ''گھر'' کوئی بھی نہیں، کہیں بھی نہیں.....سب گزرگاہیں ہیں، مسافر خانے ہیں اسی لئے نبوی تعلیمات یہاں دل لگانے کے سامان پیدا کرنے کو ناپسند کرتی ہیں۔ اور دنیا کو مزرعۃ الآخرۃ یعنی آخرت کی کھیتی فرمایا گیا کہ یہاں اصل میں ہمیشہ کے گھر کیلئے زادراہ اکٹھا کرنے کی غرض سے بھیجا گیا ہے۔ اسی لئے غنی کی تعریف یہ نہیں کی جائیگی کہ جس کے پاس مال زیادہ ہو بلکہ غنی اسکو کہا گیا جو مال کی طلب سے اور غیر اللہ کی حاجت روائی سے بے نیاز ہو۔ یعنی اللہ کی بخشش پر قانع ہو۔

روایات میں ہے کہ بنی امیہ کے ایک بیٹے نے ایک متقی و پرہیزگار انسان ابی حاتم کو خط لکھا کہ وہ اپنی ضروریات کے بارے میں اسے آگاہ کریں ابی حاتم نے خط کے جواب میں تحریر کیا'' حمد وثنا کے بعد۔ آپ کا خط مجھے ملا جس میں آپ نے میری ضروریات جاننے اور انہیں پورا کرنے کی خواہش ظاہر کی

ہے یہ بہت بعید ہے۔ میں نے اپنی ضروریات اپنے پیارے رب کے سامنے پیش کردی ہیں۔ان میں سے جواس نے مجھے عطا کردیں میں نے انہیں قبول کرلیااور جونہیں عطا کیں ان سے میں نے قناعت کرلی''

یہ ہے بندہ مومن کا طرزعمل جودرہم ودینار کا غلام نہیں بلکہ اس کا دل غنی ہے۔

آخر میں اس بات کی طرف توجہ دلادوں کہ قناعت کوہمیں اس کے حقیقی مفہوم میں سمجھنا چاہیے۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا اور حالات کو بدلنے کی کوشش نہ کرنا ہرگز قناعت کے مفہوم میں داخل نہیں۔اسی طرح اگراللہ رزق کے دروازے کھولے تواس کی عنایات سے منہ پھیرنا بھی تقویٰ اور قناعت کا مظہرنہیں۔ اللہ نے وسیع رزق دیا ہے تو اس کی عطاہے لیکن اس کواپنے تعیش کے لئے نہیں بلکہ اس کی مخلوق کی ضرورتوں پر بھی خرچ کریں۔کیونکہ اللہ نے جو مال دیا ہے اس کے حقدار بھی معین کردیئے ہیں۔مال کمانے کی کوشش ہرگز تقویٰ کے خلاف نہیں۔ مال کی محبت میں گرفتار ہونا اور اسے حقداروں پرخرچ نہ کرنا جمع کرکر کے رکھنا مستقبل کومحفوظ بنانے کیلئے حال کی ساری کوششیں مال کو بنانے اور جمع کرکے رکھنے پرصرف کرنا یہ روح تقویٰ کے خلاف ہے۔

اسی طرح نیکیوں میں آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا اور قناعت پسندی اختیار کرنا کہ اللہ نے ہمیں بس اتنے ہی کی توفیق دی تھی یہ ہرگز قناعت پسندی کے زمرے میں نہیں آتا یا برائیوں اور باطل کے غلبے کودیکھ کراپنی ذاتی نیکیوں اورعبادات پرقانع ہوجانا کہ اللہ کے بدلنے سے حالات بدلیں گے ہم اپنی ذاتی نیکیوں ہی کی حفاظت کرلیں تو کافی ہے یہ بھی روحِ قناعت کیخلاف ہے۔ اپنی مقدور بھر کوششیں اپنی انفرادی واجتماعی اصلاح کے لئے صرف کرلینا نتائج اللہ پرچھوڑ دینااور اللہ جورزق دے اس پراضی رہنا ہی شریعت کومطلوب ہے۔۔ حضرت انسؓ کا قول ہے کہ ''لوگو! تم ایسے عمل کرتے ہو جو تمہاری نظروں میں بال سے بھی کہیں زیادہ باریک ہیں مگرہم عہدِ رسالتؐ میں انہیں ہلاک کرنے والی خطاؤں میں شمار کرتے تھے''

(صحیح بخاری جلددوم۔صحیح مسلم جلداول کتاب الایمان)

☆☆☆

# مریم جمیلہ

## علم وعمل میں یکتا، ایک سچی عاشقِ رسولؐ

۱۴ ذوالحجہ ۱۴۳۳ ھجری بمطابق ۳۱ اکتوبر ۲۰۱۲ء بدھ کی صبح ایک دختر اسلام، نومسلم مذہبی سکالر، بے شمار کتابوں کی مصنفہ، مغرب میں پیدا ہو کر مشرق میں آ بسنے والی .....نورِ حق کی شیدائی محترمہ مریم جمیلہ لاہور میں انتقال کر گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون .....آیئے! ان کی سراپا جہاد، سراپا ایمان وعمل والی کتاب زندگانی کے اوراق زریں پر جستہ جستہ نظر ڈالیں کہ اس میں نشانیاں ہیں عمل کرنے والوں کے لیے .....اہل دانش کے لیے .....اہل علم کے لیے اور آخرت پر نگاہ رکھنے والوں کے لیے۔

امریکہ کے موسم بہار میں ۲۳ مئی ۱۹۳۴ء کے ایک خوبصورت دن جرمن یہودی والدین کے ہاں نیویارک میں ایک بچی نے آنکھ کھولی۔ چھ پونڈ اور گیارہ اونس وزن کی یہ بیٹی اپنی اکلوتی بڑی بہن الزبتھ مارکوس سے دس گیارہ سال بعد پیدا ہوئی تھی۔ نہایت خوبصورت، ذہین اور حساس مارگریٹ مارکوس اپنے تعلیم یافتہ اور معزز گھرانے کی آنکھ کا تارا تھی۔ بچپن ہی سے سوچ بچار، مطالعہ اور آرٹ ورک کی دنیا میں گم رہتی تھی چنانچہ کبھی بھی زیادہ سہیلیاں نہ بنا سکی کہ کھیل کود کی بجائے کہانیاں پڑھنے کی زیادہ شوقین تھی یا پھر تصویریں بنانا اس کا دل پسند مشغلہ تھا اور دوسرا شوق موسیقی سننا تھا مگر عجیب بات یہ تھی کہ تصویریں اکثر عرب لوگوں کی بنایا کرتی جنھیں اس نے کبھی دیکھا تک نہ تھا۔ بس 'نیشنل جیوگرافک' میں عربوں کی تصویریں گھنٹوں دیکھتی رہتی پھر اپنے ہاتھ سے بنا لیتی۔ قدرت نے عجیب ملکہ عطا کیا تھا اور موسیقی میں 'ام کلثوم' کے ریکارڈ سنتی۔ اسے پاپ اور جاز میوزک شروع ہی سے ناپسند تھا۔

اس کی عمر پانچ سال کی ہوگی کہ ایک دن اس کی بڑی بہن الزبتھ عرف بے ٹی اپنی سہیلیوں کے ساتھ مسلمانوں کی نماز پڑھنے کی نقل اتار رہی تھی جو اس نے کسی نیوز ریل میں چند دن پہلے ہی دیکھی تھی .....نقل کیا بلکہ تحقیر کر رہی تھی کہ مارگریٹ جسے سب پیگی کہتے تھے ..... یہ برداشت نہ کر سکی اور چلا اٹھی ''اوہ بے ٹی! بند کرو یہ سب کچھ۔ دوسروں کا مذاق مت اڑاؤ۔ تمھیں دوسروں کے مذہب کا مذاق اڑانے کا کوئی حق نہیں۔'' اس نے رو رو کر ڈرامہ ختم کروا کر ہی چھوڑا۔ سچ ہے کہ 'فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی'۔

سکول میں ابتدائی کلاسوں میں تھی کی ایسٹر کے قریب پانچویں، چھٹے گریڈ کے بچے ہاتھوں میں پتھر لے کر اس کے پیچھے بھاگتے اور چیخ چیخ کر اسے کرائسٹ کو مارنے والی،

کرائسٹ کلر، کرائسٹ کلر پکارتے۔ پتہ چلا کہ انھیں پادری نے ایسا کرنے کو کہا تھا۔

غریب بچوں سے ہمدردی.....اس کا ننھا سا، پیارا سا دل ہمیشہ سے محسوس کرتا رہتا تھا۔ گریڈ فرسٹ میں تھی کہ اپنی کلاس کی ایک پھٹے پرانے کپڑے پہننے والی، نہایت کمزور اور لاغر سی لڑکی کو روزانہ پی نٹ، مکھن اور جیلی، سینڈوچ پہ مشتمل اپنے لنچ میں شامل کر لیتی۔ اسی طرح ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں میں رہنے والے کالے بچے اسے نہایت دکھی کر دیتے۔ اس کے ڈیڈی اسرائیل کو چندہ دیتے تو یہ انھیں منع کرتی کہ یہ لوگ فلسطین والوں پر ظلم کرتے ہیں۔ آپ کے پیسے سے یہ اسلحہ خرید کر ان کے خلاف استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح گریڈ چار میں تھی کہ اسے روزانہ سکول دیر سے آنے پر ڈانٹ پڑنے لگی۔ تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ ہمسائی کی لڑکی کنڈرگارٹن میں داخل ہوئی ہے وہ سڑک پار نہیں کر سکتی اور پیگی اسے ساتھ لے کر آتی ہے مگر وہ ناشتہ کرنے میں پورا آدھا گھنٹہ لگا دیتی ہے جو صرف ایک ابلے انڈے پر مشتمل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس طریقے سے ناشتہ کرنے والی چلتی بھی کیسی سست رفتاری سے ہو گی۔ یوں رحم دل اور مہربان پیگی اس کی خاطر ڈانٹ کھاتی رہی۔

۱۹۴۱ء کی عالمی جنگ میں پیگی سات سال کی تھی۔ لائف میگزین میں جرمن اور روسی فوجیوں کی خون آلود لاشوں کی تصویریں اس کے ننھے سے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئیں وہ خود کو مجرم محسوس کرتی کہ ''میں تو یہاں پیٹ بھر کر کھانا کھا رہی ہوں اور یورپ میں ملین لوگ بھوک سے مر رہے ہیں۔''

اسی عمر میں یہ حساس سی لڑکی سمر کیمپ میں قیدیوں کے متعلق بہت سی تصویریں بناتی ہے اور ایک نظم لکھتی ہے۔ تصویریں ایسی خوبصورت بنائیں کہ تین سو والدین کے سامنے سٹیج پر جا کر اسے دکھانے کو کہا گیا۔ اسی طرح فینسی ڈریس شو میں بھوت بننے پر اسے اول انعام دیا گیا۔ تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال یہ لڑکی نئی اور پرانی گڑیاں جمع کرتی پھر ان کے خوبصورت کپڑے سی کر انھیں ٹھیک ٹھاک کر کے کرسمس کے قریب ایسے غریب بچوں کو دیا کرتی جن کے والدین انھیں کھلونے خرید کر دینے کی استطاعت نہ رکھتے۔ ایک مرتبہ اپنے تمام شدہ پیسوں سے ام کلثوم کی آواز قرآن کی کیسٹ خرید لائی اور ایک خوبصورت لوری۔ پھر انھیں شوق سے سنا کرتی۔ فلمیں دیکھنا، ڈانس کرنا اسے پسند نہ تھا۔ سکول میں بھی ڈانس نہ کرنے پر مشکلات کا سامنا کرتی۔ والدین سے ڈانٹ کھانا پڑتی حالانکہ گھڑ سواری اور تیراکی کے کاموں میں طاق تھی۔

اس کا زیادہ تر وقت لائبریری میں گزرتا۔ پہلے سکول کی پھر ذرا بڑی ہونے پر نیویارک کی پبلک لائبریری میں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا مطالعہ وسیع اور پرواز فکر بلند تھی۔ ایک قدیم انسائیکلوپیڈیا ''دی ورلڈ بک'' سارا ہی کھنگال ڈالا اور 'عبدالقادر الجزائری' کی داستانِ حیات اس کی پسندیدہ کتاب تھی۔ اسی مطالعے کے دوران بارہ سال کی عمر میں اس

نے خود ایک ناول لکھنے کا خاکہ تیار کیا۔ 'احمد خلیل' کے نام سے جس کی بڑی خوبصورت تصاویر اس نے پہلے ہی تیار کر لیں اس کے کرداروں کے ناموں سے پیگی کے ذہن کی سمت اور اسلامی مطالعے کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں بھائی کا نام خلیفہ، باپ کا نام ملک وہاب اور ماں کا نام خدیجہ رکھا ہے۔ اپنے والدین کے نام ایک خط میں خود بتایا ہے کہ ''میں نے احمد خلیل کی ماں کا نام خدیجہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی بیوی کے نام پر رکھا ہے۔''

ان حالات میں پیگی کی ایک سمر کیمپ ڈائریکٹر کی اس کے بارے میں رائے ہمیں حیران نہیں کرتی۔ امریکی معاشرے میں ایک مومن روح کی حامل پیگی ..... جسے آگے چل کر ۲۷ سال کی عمر میں مریم جمیلہ کے روپ میں ایک عظیم مجاہدہ، مبلغہ، مصنفہ بننا تھا اس کے بارے میں اسی قسم کے تاثرات کی توقع ایک امریکی عورت سے ہوسکتی ہے۔ ہونہار پیگی نے جب اگلے سال بھی اس کیمپ میں شمولیت کے لیے اجازت مانگی تو اس کی ڈائریکٹر پھٹ پڑی۔

''یہ ناممکن ہے۔ میں نے تمھارا ایڈمشن قبول کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ ہم لائق اور ہونہار نوجوان چاہتے ہیں جن کی اتنی قابلیت ہو کہ وہ رقص سیکھ سکیں اور تمھارے اندر ڈانس سیکھنے کی کوئی قابلیت نہیں ہے۔ حقیقتاً تم جیسے انوکھے اور عجیب بچے سے اپنی پوری زندگی میں پہلی بار ملی ہوں ..... تمھارے والدین کو میں نصیحت کروں گی کہ وہ تمھیں کسی سائیکاٹرسٹ کے پاس لے کر جائیں۔'' (حق کی تلاش ص ۳۶)

اساتذہ اس سے نالاں ..... سہیلی اس کی ایک آدھ ..... والدین اس سے عاجز آئے ہوئے کہ یہودیوں سے نفرت اور عربوں کی حمایت کرتی ہے۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے اس لڑکی کے جذبات واحساسات کا ..... ہمت واستقلال کا .....اور صبر واستقامت کا۔ مگر ابھی عشق (حقیقی) کے امتحان اور بھی تھے۔ کالج میں متعصب اساتذہ پڑھاتے پڑھاتے بات مسلمانوں پر لے آتے پھر خوب ان کے لتے لیتے ان کے معاشرتی نظام پر برستے۔ عورت پر جبر روا رکھنے کا جھوٹ سچ گھڑتے اور جب پیگی اپنے مطالعہ کے بل پر ان سے اختلاف کرتی، دلیل سے بات کرتی تو اساتذہ کی طرف سے سرد مہری، بدمزاجی کے ساتھ ساتھ سی گریڈ بھی عنایت ہو جاتا اور ذہین وفطین لڑکی جو دوسرے کئی مضامین میں اے گریڈ لیا کرتی اس ظالمانہ، تعصّبانہ رویے پہ احتجاج بھی نہ کرسکتی۔ بس دل میں ..... سینے پہ ایک داغ ضرور سجا لیتی۔ یوں دل داغ داغ لیے یہودیت سے متنفر .....حق کی متلاشی شب و روز مطالعے میں مصروف رہتی۔ تقابل ادیان، تاریخ، نفسیات، لسانیات نہ جانے کیا کیا پڑھتی رہتی کیا کیا سوچتی رہتی۔ والدین اگرچہ سخت یہودی نہ تھے بلکہ روشن خیال ہوتے ہوئے عیسائیت کے قریب ہو گئے تھے مگر اسلام.....؟ اسلام کے لیے تو ان کا بغض ان کے مونہوں سے پھوٹا پڑتا تھا۔ اسلام تو ان کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتا تھا اور راسخ العقیدہ مسلمان اس سے بھی زیادہ۔

تنہائی اور تفکر تو شروع سے پیگی کی زندگی کا لازمی حصہ تھے۔ وہ مختلف تنظیموں میں شامل ہوتی رہی۔ قلمی دوستی کرتی رہی۔ سوچتی رہی ..... پڑھتی رہی۔ تلاش حق کا ایک مسلسل سفر تھا جس پر وہ پامردی سے چلتی رہی۔ اس سفر میں دھوپ ہی دھوپ تھی کانٹے ہی کانٹے تھے۔ پھر بھی دل کی کیفیت اس سے مختلف بھلا کیا ہوتی۔

راہِ وفا میں ہر سو کانٹے، دھوپ زیادہ سائے کم
پھر بھی اس پر چلنے والے خوش ہی رہے پچھتائے کم

عجیب بات ہے کہ شاعر و ادیب اسے مسلم پسند تھے۔ کلامِ اقبال کا اگرچہ ترجمہ ہی پڑھا تھا نکلسن کا 'اسرارِ خودی' کا پھر بھی اقبال کی مداح ہوگئی اور کہا ''اقبال وہ پہلے شاعر ہیں جن کی شاعری اسلام کے گرد گھومتی ہے ..... جب باہر کھانا کھاتی تو تلاش کر کے شام اور ترکی ریسٹورنٹ پر..... جہاں بھنا ہوا گوشت، کوفتے، چاول بہت شوق سے کھاتی اور جو پیسے کم ہوتے تو دال چاول بھی اسی رغبت سے تناول کرتی ..... جہاں کوئی نومسلم لڑکی ملتی اسے یوں سہیلی بنا لیتی جیسے اب تک اسی کی تو تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھی..... گھریلو حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ کب سے ذہنی دباؤ کا شکار چلی آ رہی تھی اوپر سے ہوسٹل کا طبیعت کے خلاف ماحول ..... چنانچہ شدید اعصابی کمزوری کا شکار ہو گئی۔ یوں یونیورسٹی آف روچیسٹر میں داخلہ لے کر بھی تکمیل تعلیم نہ کر سکی اور گھر آ گئی۔ شوقِ تلاش حق فزوں سے فزوں تر ہوتا جا رہا تھا ادھر مشکلات اور مخالفت زوروں پر تھی۔ والدین اس کے اس جذبۂ ایمانی کو دماغی خلل پر محمول کرتے رہے اور ایک سے ایک سائیکاٹرسٹ کو دکھاتے رہے یہ اور الجھتی رہی پریشان ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ ایک وقت وہ آیا کہ اس کے والدین اسے دماغی امراض کے ہسپتال المعروف پاگل خانے میں چھوڑ آئے۔ اپنی اکلوتی بہن بے ٹی کے نام ایک خط میں پیگی نے لکھا۔

''کیا تم سوچ سکتی ہو کہ میرے ساتھ والے قید تنہائی کے کمرے میں کس کو رکھا گیا ہے؟..... جب سے ذہنی مریضوں کے اداروں اور پاگل خانوں میں بجلی کے جھٹکوں اور نشہ آور ادویہ کے استعمال سے علاج شروع کیا گیا ہے ان مریضوں کو پاگل پن کے دورے بار بار پڑتے ہیں اور ان کی پاگل پن کی بیماری عود کر آتی ہے ..... ان سے تعاون نہ کرنے والوں اور معاشی مدد نہ کرنے والوں کو یہ ادارے اٹھا کر حکومتی ذہنی مریضوں کے اداروں میں بھیج دیتے ہیں اور وہ وہاں ساری زندگی پڑے سڑتے رہتے ہیں۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ کیا میں کبھی یہاں سے نجات پا سکوں گی ..... بہت سا پیار، پیگی۔''

ہماری یہ پاک طینت، پاک دامن معزز بہن نہ جانے کیا کیا دعائیں کرتی ہوگی .....؟ اللہ وحدہ لاشریک کو کتنے پیارے جذبے سے پکارتی ہوگی کہ تقریباً دو سال کی طویل مدت کے بعد ایک ایسٹر پر اسے ایک ماہ کے لیے آزمائشی طور

پر گھر بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔

گھر آ کر وہی ماحول.....وہی سختی.....وہی اجنبیت کی فضا تھی۔ بلکہ اب ذہنی دباؤ ایک اور طرح سے اور زیادہ ہو گیا تھا کہ اگر ممی ڈیڈی نے خفا ہو کر دوبارہ ہسپتال فون کر دیا کہ اسے لے جائیں تو پھر کیا ہو گا؟.....وہ خود ایک خط میں لکھتی ہے۔

''اس پر ڈیڈی کی مسلسل یاددہانی کہ ''پیگی! ہم تمھیں سہارا دینے کے لیے ہمیشہ نہیں رہیں گے، تمھیں اپنے گزر اوقات کے لیے خود کمانا چاہیے۔''

ڈیڈی! میں جیسی بھی ہوں آپ مجھے ویسا قبول کیوں نہیں کرتے۔ آپ کی نصیحت پر عمل کرنے کے لیے مجھے اپنے آپ کو دوہری شخصیت میں ڈھالنا پڑے گا۔''

شدتِ جذبات سے ڈیڈی مجھ پر برس پڑے۔ ''پیگی! تم سخت سست ہو اور کوئی کام کرنا نہیں چاہتی تمھاری ہر سوچ، ہر بات صرف اسلام کے بارے میں ہوتی ہے۔''

اس پر میں بھی غصے میں آ گئی۔ ''تم اس وقت اپنے کمرے میں چلی جاؤ۔'' ڈیڈی نے مجھے حکم دیا۔ ''اگر تم نے مزید کچھ بولا تو میں ہاسپٹل کال کروں گا اور وہ تمھیں آ کر لے جائیں گے۔''

روتے ہوئے میں نے ڈیڈی سے اپنے رویے کی معافی مانگی اور ڈیڈی نے بھی اپنے سخت الفاظ استعمال کرنے پر معذرت کی۔ ڈیڈی نے مجھے کہا کہ ''میں نیویارک کے صنعتی ڈویژن والوں کو کال کروں گا کہ تم وہاں ٹائپنگ کا کورس کرو تاکہ تمھیں ملازمت ڈھونڈنے میں آسانی ہو جائے۔'' میں نے بڑی مشکل سے مسکراتے ہوئے آہستگی سے کہا ''ٹھیک ہے ڈیڈی۔''

ہماری یہ عظیم اور بہادر مارگریٹ نہیں جانتی تھی کہ اس کورس میں قدرت نے اس کے لیے کیا آسانیاں رکھ دی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ٹائپنگ کا یہ کورس.....عمر بھر کے لیے ٹائپ رائٹر کو اس کی زندگی کا لازمی حصہ بنا گیا۔

اسی دوران اسلامی ملکوں کے مذہبی سکالرز کے ساتھ خط و کتابت کا ایک سلسلہ بھی شروع کر دیا تاکہ مکمل اسلامی علم حاصل ہو جائے۔ ان میں الجیریا کے ایک انقلابی عالم دین محمد بشیر ابراہیمی، الازہر یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد الباھی، ڈاکٹر سعید رمضان (حسن البنا شہید کے داماد) سید قطب اور پاکستان کے سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نام قابل ذکر ہیں۔ سید مودودی.....جنھیں سب سے زیادہ مخلص شخصیت تحریر کیا ہے۔

واشنگٹن کے اسلامک سنٹر میں مسجد کو دیکھ کر ایک عجیب طرح کا سکون محسوس کرنے والی ..... بروکلین کے اسلامک مشن آف امریکہ میں بار بار آنے جانے والی اور اس کے سربراہ شیخ داؤد احمد فیصل سے مکالمہ کرنے والی پیگی اب اخبارات میں ..... جرائد میں قیمتی مضامین بھی لکھنے لگ گئی تھی۔ اخبار میں اس کا پہلا مضمون دیکھ کر اس کے ڈیڈی خوش تو بہت ہوئے مگر ساتھ ہی پیشانی پر بل بھی پڑ گئے۔ ''پیگی! پھر وہی اسلام؟ اور ہاں! کیا ہی اچھا ہو کہ تم ان کا معاوضہ بھی

وصول کرو کیونکہ ہم یہاں ہمیشہ تمھیں سہارا دینے کے لیے نہیں رہیں گے۔''

مضامین لکھتے ہوئے پیگی نے ایک اہم فیصلہ کیا جیسا کہ ایک خط میں لکھا ہے۔

''میں اپنے ٹائپنگ کرنے کے علم کو ایک بہت اہم کام میں لگا رہی ہوں اور وہ یہ ہے کہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں اپنی باقی ماندہ زندگی اسلام سے متعلق لکھنے کے لیے وقف کر دوں گی۔ محمد اسد کی لکھی ہوئی ''روڈ ٹو مکہ'' کے بعد اب ان کی ایک اور کتاب ''اسلام ایٹ دی کراس روڈز'' میرے ادبی کیریئر کے لیے ایک سنگ میل کی حیثیت اختیار کر گئی ہے ..... چونکہ یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے اس لیے میں اس موضوع پر تفصیل سے لکھنے کا ارادہ رکھتی ہوں آج کل اس موضوع پر مضامین کا ایک مجموعہ تحریر کر رہی ہوں جس کا عنوان میں نے ''اسلام اینڈ دی ویسٹ'' رکھا ہے۔''

قلمی جہاد کا یہ سفر شدومد سے جاری رہا۔ جون ۱۹۶۰ء کے 'اسلامک ریویو' جرنل میں آصف اے فیضی کے مضمون Reinterpretation of Islam کے رد میں لکھا ہوا تفصیلی مضمون شائع ہوا جس میں تمام مسلمانوں کو خبردار کیا گیا تھا کہ ان کا انجام بھی اللہ نہ کرے یہودیوں جیسا ہوگا اگر انھوں نے اسلام کے اصولوں کو بدلنے کی کوشش کی۔

اس علمی، تحقیقی کام کے ساتھ ساتھ والدین کے ساتھ حق و باطل کی جنگ بھی منطقی انجام تک پہنچا ہی چاہتی تھی۔ چنانچہ اپنی اکلوتی بہن بٹی کو ایک خط میں یوں خبر دیتی ہے۔

''..... افسوس ناک طور پر میرے ممی ڈیڈی سے تعلقات ٹوٹنے کے قریب ہو گئے ہیں۔ میرے خیال میں وہ تمھیں اس جھگڑے کے متعلق پہلے ہی بتا چکے ہیں جو کہ میرے اور ڈیڈی کے درمیان اسرائیل کی چندہ اپیل پر ہوا ..... ایک شام میں نے ڈیڈی کی سٹڈی ٹیبل پر ۲۰۰ ڈالر کا چیک پڑا ہوا دیکھا جو کہ انھوں نے ''یونائیٹڈ جیوش اپیل'' کے لیے لکھ کر رکھا ہوا تھا۔ ممی نے بھی ڈیڈی کی طرف داری کی یہ کہتے ہوئے کہ چندہ انسانی ہمدردی کے تحت ان اسرائیلیوں کو جائے گا جو ہاسپٹل میں بیمار یا زخمی ہیں۔ لیکن میں ان پر بہت زور سے چلائی ''ہاں آپ لوگ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ پیسہ اسرائیل کو جائے گا جس سے وہ ہتھیار خریدیں گے اور اس سے وہ بے گناہ فلسطینیوں کو ماریں گے۔ بالکل آپ بھی ان کے قتل میں برابر کے شریک ہیں۔''

ڈیڈی بہت غصے میں چیخے ''تم اسی وقت اپنے کمرے میں چلی جاؤ اور باہر مت آنا۔'' میں اپنے کمرے کی طرف بھاگی اور زور زور سے رونے لگی۔ دو گھنٹے کے بعد جب میں ہمت کر کے کمرے سے باہر نکلی تو ڈیڈی نے مجھے کہا کہ میں نیویارک میں علیحدہ رہائش کا بندوبست کر لوں کیونکہ ہمارے رہن سہن اور سوچ میں بہت فرق ہے، اب ہم امن سے ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔

چنانچہ پیگی گھر سے ہوسٹل میں منتقل ہو گئی جہاں وہ مشرقی علوم سے دل بھر کر استفادہ کرتی رہی اور استطاعت کے مطابق اسلامی کتب خریدتی رہی۔ مشکوٰۃ المصابیح کی تین

جلدیں خرید نے پر اپنی ساری جمع پونجی لگا دی صرف ڈیڑھ ڈالر پاس رکھا جس میں ہفتہ گھر گزارنا تھا۔ کیسے؟ اس کی فکر نہ تھی خوشی تو اس بات کی تھی کہ نفع بخش سودا کرلیا ہے۔ یوں ہفتہ بھر بھوکے پیٹ رہ کر احادیث کے مطالعہ سے روحانی غذا حاصل کرلوں گی..... پہلا ترجمہ قرآن کسی عیسائی شخص کا ہاتھ لگا ذرا بھی اطمینان نہ ہوا فوراً جان گئی کہ عیسائیت کا تعصب جھلک رہا ہے اس میں۔ پھر ایک دن لائبریری سے پکتھال نومسلم کا ترجمہ اسے مل گیا پھر تو وہ اس میں ڈوب گئی بلکہ اپنا ذاتی نسخہ حاصل کیا۔ وہ بہن کے نام لکھتی ہے۔

''اور اب تو قرآن پاک میرا مستقل ساتھی بن گیا ہے۔ جب اس کا ایک نسخہ پڑھنے سے بہت پھٹ گیا تو میں نے نیا خرید لیا۔ یہ شروع صفحے سے لے کر آخر صفحے تک ایک سچی وحی تھی۔ اس نے میری آنکھیں اس سچائی کے لیے کھول دیں جو میں پہلے نہیں جانتی تھی..... میں اس کا ایک ایک صفحہ دن رات پڑھنے میں لگ گئی..... اگرچہ میں صرف ۱۹ سال کی ہوں لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ میری زندگی کا خاتمہ قریب ہی ہے۔ میں دل شکستہ، تھکی ہوئی اور پژمردہ تھی۔ مجھے ہر جگہ سے رکاوٹ کا سامنا تھا۔ جب بھی میں نے معاشرے میں اپنی جگہ ڈھونڈھنی چاہی مجھے دھتکار دیا گیا۔ نہ ہی یہودیت، آرتھوڈوکس، آتھیکل کلچر اور بہائی میری روح کی دلجوئی کر سکے..... بالکل اس مقام پر پکتھال میرے بچاؤ کے لیے آیا یہاں پر آخر کار میں نے اپنی پہچان ڈھونڈ لی۔ قرآن پاک کا ترجمہ پڑھنے کے بعد میری پہلی سوچ یہی تھی کہ یہ واحد سچا مذہب ہے جو اخلاص اور دیانتداری پر مشتمل ہے..... سب سے بری چیز جو میں نے یہودیت اور عیسائیت میں پائی وہ یہ تھی کہ بجائے اس کے وہ بدی کے خلاف جنگ کرتے۔ انھوں نے اسے جوں کا توں قبول کرلیا سوائے چند مذہبی کیتھولک کے اور کچھ تنگ نظر پروٹسٹنٹ کے۔ کوئی بھی بائبل کو غلطیوں سے پاک نہیں سمجھتا۔ تورات میں بیان کی گئی عبرانی روایات کے برعکس مقدس قرآن برائی کے ساتھ کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے سے انکار کرتا ہے چاہے وہ معاشرتی ہو یا اخلاقی۔ قرآن پاک میں ایک جگہ بیان ہوا ہے:

''مسلمانو! تم بہترین امت ہو جو بنی نوع انسان کے لیے اٹھائی گئی ہے تم نیکی کی نصیحت کرتے ہو اور برائی کے خلاف جہاد کرتے ہو اور تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔''

سالہا سال کی کشمکش..... سخت کشمکش کے بعد آخر وہ روزِ سعید آ ہی گیا کہ جس دن مارگریٹ کی قسمت میں رب رحمٰن و رحیم نے بھلائی مقرر کر دی تھی، اس مارگریٹ عرف پیگی کی قسمت میں جس نے شروع دن سے شراب کا ایک قطرہ تک نہیں چکھا، کبھی سگریٹ کا ایک کش تک نہیں لگایا..... جس نے ڈانس نہیں کیا..... کسی کو فضول دوست نہیں بنایا غرض جو اس سوسائٹی میں رہتے ہوئے بھی سب سے جدا تھی .....سب سے زیادہ باحیا تھی۔ چنانچہ اپنے والدین کو یکم جون ۱۹۶۱ء کو یوں اطلاع کرتی ہے۔

''ڈیئر ممی اور ڈیڈی! چونکہ مدت سے ہماری سوچ، رائے اور طرزِ زندگی میں اختلاف ہونے کی وجہ سے گھر میں

بہت سے جھگڑوں اور بحث ومباحثے نے جنم لے لیا تھا اور اب جب سے میں یہاں خواتین کے ہاسٹل میں علیحدہ رہی ہوں تو اب ہم سب اپنی جگہوں پر خوش ومطمئن ہیں.....اب جبکہ میں اپنے اسلام کا عام اعلان کر چکی ہوں، میں اب ایک مسلمان ہوں۔۲۴ مئی ۱۹۶۱ء کی عیدالاضحیٰ پر 'اسلامک مشن' میں دو گواہوں خدیجہ فیصل اور بلقیس محمد کی موجودگی میں شیخ داؤد احمد فیصل نے مجھے کلمہ شہادت اور چھ کلمے با آواز بلند پڑھائے اور انھوں نے میرا اسلامی نام ''مریم جمیلہ' رکھا ہے تو آج سے آپ نے مجھے پیگی نہیں بلکہ مریم جمیلہ کہنا ہے۔ عید کے کھانے کے بعد شیخ نے اسلام قبول کرنے کا سرٹیفکیٹ دیا ہے جو کہ میرے لیے قابل فخر متاع ہے۔

بہت سا پیار.....مریم جمیلہ''

اب ہماری مکرم ومحترم آپا مریم جمیلہ صاحبہ کے لیے امریکی فضاؤں اور ہواؤں میں رہنا سخت دشوار ہو گیا اور ہاں انھوں نے خدیجہ فیصل سے پورا ایک دن وضو اور نماز سیکھنے میں لگا دیا۔ دو ہفتوں کے بعد پوری عربی نماز اور کچھ چھوٹی سورتیں بھی یاد کر لیں۔ ہر قسم کے میک اپ سے عاری چہرہ، ڈھیلے ڈھالے باپردہ لباس میں ملبوس، حجاب کی سختی سے پابند .....مریم جمیلہ امریکہ سے ہجرت کرنے والی ہیں۔صرف اور صرف اللہ قادر مطلق کے نام پر ہجرت .....اس کے دین پر عمل کرنے کے لیے ہجرت ..... کیسی قابل رشک تھی یہ ہجرت۔

ڈاکٹر سعید رمضان کو اپنے اس ارادے کی اطلاع کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''میرے عزیز اسلامی بھائی! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

جب سے میں نے سید ابوالاعلیٰ مودودی سے خط و کتابت شروع کی ہے اور اس بات کو تقریباً ڈیڑھ سال کا عرصہ ہو گیا ہے انھوں نے بار بار مجھے اس بات کی دعوت دی ہے کہ میں امریکہ سے پاکستان ہجرت کر جاؤں .....وہاں جا کر ان کے گھرانے کے ساتھ ایک فیملی ممبر کی حیثیت سے رہوں .....اب جبکہ میرے لیے یہاں کے حالات ناقابل برداشت ہو گئے ہیں اور میں نے یہ بات محسوس کر لی کہ میں یہاں کے معاشرے کے ساتھ مزید چل نہیں سکتی۔ میں اس بات پہ قائل ہو گئی ہوں کہ میرے لیے نجات کا واحد راستہ یہی ہے کہ میں کسی مسلمان ملک میں ہجرت کر جاؤں اور زندگی کے باقی ماندہ دن وہیں پہ گزار دوں۔ میں نے اس مقصد کے لیے پاکستان کو چنا ہے کیونکہ مولانا مودودی نے مجھے پیشکش کی ہے کہ وہ مجھے گھر اور فیملی مہیا کریں گے اور ایسی پیشکش مجھے اور کہیں سے نہیں آئی۔''

اور پھر ۲۴ اپریل ۱۹۶۲ء کو مریم جمیلہ نے نیویارک سے آخری خط اپنے والدین کو لکھا۔ یہ خط اگرچہ طویل ہے مگر ایک ایک سطر اس قابل ہے کہ اس پر غور کیا جائے۔ مگر طوالت کے خوف سے اس کے چند ایک حصے پیش خدمت ہیں:

''پیارے ممی اور ڈیڈی!

اب جبکہ مولانا مودودی کی دعوت کو قبول کرتے ہوئے پاکستان جا رہی ہوں، میں اس سفر کی تیاری میں بہت مصروف ہوں ۔ ڈاکٹر سعید رمضان، ڈاکٹر حب اللہ، ڈاکٹر نورالدین شوریبا اور شیخ داؤد احمد فیصل سب نے مجھے نصیحت کی ہے کہ میں جتنا جلد ہو سکے پاکستان جانے کی تیاری کروں ۔ میں آپ کی بہت مشکور ہوں گی اگر آپ مولانا مودودی کے نام خط میں اس بات کی منظوری دیں کہ آپ میرے پاکستان جانے کی راہ میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں کریں گے ۔ اگر میرے خاندان کو میرے مذہبی خیالات سے اتفاق نہیں ہے تو اسے یہ حق بھی حاصل نہیں ہے کہ وہ مجھے اس راہ میں ایذا دیں ۔ مذہبی آرتھوڈوکس یہودیوں میں اگر ان کا کوئی فرد کسی اور مذہب کو قبول کر لے تو وہ ان کے لیے مردہ تصور کیا جاتا ہے ۔ میں نے پہلے ہی اپنا پاسپورٹ اور ویزہ محفوظ کر لیے ہیں اور اب بحری جہاز کی ریزرویشن کروا رہی ہوں ۔ اگر سب کچھ ٹھیک رہا، تو ان شاءاللہ ۱۸ مئی کی شام نیویارک سے روانہ ہو جاؤں گی اور "Greek Freighter" (بحری جہاز کا نام) کے ذریعے پاکستان روانہ ہو جاؤں گی ۔ چونکہ بحری جہاز کی رفتار انتہائی سست ہوتی ہے، اس لیے مجھے پاکستان پہنچنے میں ۶ مہینے لگیں گے، بحری جہاز مجھے کراچی پہنچائے گا ۔ چونکہ میں کراچی سے لاہور تک کا سفر تھرڈ کلاس ٹرین کے ذریعے نہیں کر سکتی، اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں کراچی سے لاہور تک کا سفر بذریعہ ہوائی جہاز کروں گی ۔ میں جانتی ہوں کہ آپ مجھے ایک دور دراز ملک کی طرف سفر کرتے دیکھ کر بہت دل گرفتہ ہوں گے، یہ جانتے ہوئے کہ کیا کبھی ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے ۔ بہت عرصے سے آپ یہ چاہتے تھے کہ میں ایک آزاد اور خود مختار زندگی گزاروں ۔ والدین ہونے کی حیثیت سے آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ نوجوان پرندے کو اپنے آشیانے کی تلاش میں گھونسلے سے ایک نہ ایک دن اڑنا ہی ہوتا ہے ۔

میں اصل میں ''محمد اسد'' کے نقش قدم پر چلتے ہوئے بالکل وہی کرنے کی کوشش کر رہی ہوں جو انھوں نے اپنی خوبصورت اور پراثر کتاب "Road to Mecca" میں بیان کیا ہے، ایک ایسی کتاب جسے میں نے کئی بار پڑھا اور جس نے مجھے مسلمان بنانے میں اہم کردار ادا کیا ۔ لیکن انھوں نے یہ سب ۱۹۲۲ء میں کیا ۔

اور اب ۴۰ سال گزر جانے کے بعد تمام مسلمان ممالک 'اتاترک' کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وہی کچھ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو اس نے ترکی کو مغرب زدہ بنانے کے لیے کیا ۔ ان میں صدر جمال عبدالناصر، حبیب بورگیبا اور صدر ایوب خان جیسے لوگ انتہائی جوش کی حالت میں نام نہاد ''ترقی'' اور ''روشن خیالی'' کے نام پر اپنے ملکوں کو مغرب زدہ کر رہے ہیں اور میں چاہے چالیس سال یا ۷۰ سال بھی گزر جائیں، پھر بھی روایتی طرزِ زندگی ہی گزارنا چاہوں گی جو قدرت سے قریب اور روحانیت سے بھرپور ہو، یہ جانتے ہوئے کہ وہاں پر رہنے والے ''ترقی پسند'' مسلمان ایسا طرزِ زندگی بالکل بھی پسند نہیں کرتے اور وہ اپنے اسلام سے اتنی

ہی نفرت کرتے ہیں جتنا کہ ایک غیر مسلم کرتا ہے۔ میں حقائق سے بے خبر نہیں ہوں۔ میں یہ جانتی ہوں کہ اب کے مسلمان ممالک اس چیز سے خالی ہیں جو محمد اسد نے اپنی کتاب میں بیان کیا۔ سب کچھ بدل چکا ہے۔ ان ممالک میں بہت برے طریقے سے بگاڑ پیدا ہوا۔ لیکن مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تمام زندگی کو دہریت، سیکولرازم اور مادہ پرستی کے خلاف جہاد کے لیے وقف کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ مجھے ان کے گھرانے میں وہ روایتی اور حقیقی اسلام مل جائے گا جس کی مجھے تلاش ہے۔ صرف ایک گھرانہ اور کچھ ہم خیال ساتھی مل جائیں اور اگر یہ سب مجھے مل گیا تو میں اپنی جڑیں وہیں پر گہری کر کے اپنے آپ کو جذب کر دوں گی۔ اگر سب کچھ خیریت سے رہا تو میرا ارادہ لاہور میں ہمیشہ کے لیے رہنے کا ہے۔

میں امریکہ واپس لوٹنے کی ذرہ برابر خواہش نہیں رکھتی۔ چاہے وہ کتنا ہی مختصر ہو لیکن میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں ہمیشہ خطوط کے ذریعے رابطہ برقرار رکھوں گی۔ تو ان شاءاللہ میں وہاں کے تمام حالات اور تجربات تفصیلی طور پر اپنے خطوط میں آپ کو لکھا کروں گی۔

چونکہ یہاں میری کتابیں کافی مقدار میں ہیں اور بھاری ہیں، اس لیے میں نے انھیں (Surface Mail) سمندری ڈاک کے ذریعے پہلے ہی مولانا مودودی کے ایڈریس پر روانہ کر دیا ہے۔ میں نے اپنے تمام فراک کسی کو دے دیے ہیں اور میں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا ہے کہ میں آئندہ کبھی بھی یہ مغرب زدہ لباس نہیں پہنوں گی۔ اب میں نے اپنے لیے لمبا ڈھیلا ڈھالا اسکرٹ سیا ہے۔ اس کے علاوہ میں نے اپنے لیے بہت سے سکارف بھی خریدے ہیں تاکہ میں ان سے اپنے بالوں کو اور جسم کو اچھے طریقے سے ڈھانپ سکوں۔ ہمارا بحری جہاز راستے میں سوڈان اور سعودی عرب کی بندرگاہوں پر قیام کرے گا اور وہاں پر رہنے والی تمام عورتیں بہت سختی سے پردہ کرتی ہیں۔

میں نے اپنا بھاری ٹائپ رائٹر دے کر اس کی جگہ ہلکا پھلکا قسم کا ٹائپ رائٹر خرید لیا ہے تو اس طرح میں اسے اپنے ساتھ آسانی سے لے کے جا سکوں گی۔ میں اپنے ساتھ اپنے ناول ''احمد خلیل'' کا مسودہ بھی لے جا رہی ہوں۔ اس کے علاوہ اپنی نصف تکمیل شدہ کتاب "Islam and Modernism" بھی اس امید پر لے کر جا رہی ہوں کہ وہاں جا کر یہ چھپ سکے۔

لاہور کے پبلشر شیخ محمد اشرف نے میری کتاب "Islam Versus the West" کی طباعت مکمل کر کے اس کو چھاپ دیا ہے اور اس کتاب کی ۲۰ مفت کاپیاں مجھے بھی بھیجی ہیں۔ اس کی ایک کاپی میں آپ کو بھی بھیج رہی ہوں تاکہ آپ دیکھ سکیں کہ آپ کی بیٹی کتاب کی مصنفہ ہو گئی ہے۔ میں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی ہوں کہ محمد اشرف نے اسے بڑی نفاست کے ساتھ طبع کروایا ہے۔

نیویارک پبلک لائبریری کے شعبہ مشرقی علوم میں کام کرنے والے مسٹر پار (Parr) کو میں نے اپنے ناول ''احمد

خلیل'' کی تصاویر دکھائیں اور روایتی عرب زندگی کے مناظر جس طرح میں نے اپنی ہاتھ سے بنی پینٹنگز میں سمو دیے تھے۔ میں نے مسٹر پارکو بتایا کہ میں یہ آرٹ کا کام اپنے ساتھ پاکستان نہیں لے جاسکتی۔ کیونکہ مولانا مودودی نے مجھے لکھا ہے کہ اسلام میں انسانوں اور جانوروں کی تصاویر بنانا قطعاً حرام ہے۔ میں نے مسٹر پارکو مزید بتایا کہ گومولانا مودودی اس بات پر حق بجانب ہیں لیکن میری ان تصاویر سے اتنی جذباتی وابستگی ہے کہ میرے لیے ان کو ضائع کرنا ممکن نہیں۔ میں نے مسٹر پارسے التجا کی کہ وہ ان تصاویر کو تحفے کے طور پر قبول کرلیں۔ آپ لوگوں نے ان تصاویر کو بہت عرصے تک ایک منتشر ذہن کی اختراع سمجھا لیکن آپ لوگوں کے برخلاف لائبریری کے آرٹ ڈیپارٹمنٹ نے اپنی آرٹ کولیکشن کے لیے بڑی خوشی سے قبول کرلیا۔

ام کلثوم کی عربی موسیقی کی ریکارڈنگز کو بھی میں نے ضائع کرنا تھا کیونکہ مولانا مودودی نے مجھے بتایا ہے کہ اس طرح کی موسیقی اسلام میں حرام ہے اور میں انھیں اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتی۔ تاہم اسلامی فاؤنڈیشن میں مجھے کچھ عرب نوجوان ایسے مل گئے جنھوں نے انھیں بخوشی قبول کر لیا۔

.....میری ایک نومسلم سہیلی نے مجھے بتایا کہ اس نے خواب دیکھا ہے کہ میری شادی ایک مخلص مسلمان سے ہوگئی ہے اور پھر میں نے ایک خوبصورت بیٹے کو جنم دیا ہے۔ کیا یہ خواب سچا ہوسکتا ہے؟ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی بہتر جانتی ہے اور میں صرف اسی کی ذات پر بھروسا کرسکتی ہوں۔

.....میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میں بھی آرام دہ زندگی، اچھی خوراک، اچھے کپڑے، اچھی صحت، فیملی کی محبت اور دوستی سے اسی طرح لطف اندوز ہوتی ہوں جس طرح آپ لوگ، ہمارے درمیان سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ اگر آپ سے یہ سب (سامان تعیّشات) چھن جائے تو آپ کی زندگی اپنے معانی کھو جائے گی اور آپ لوگوں کے لیے زندہ رہنا دوبھر ہو جائے گا۔ اس کے برعکس میرا یا دوسرے مومنین کا یہ حال نہیں ہے۔ لذت کا ہماری زندگی کے اصل مقصد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ زندگی کا اصل مقصد خدا کی ذات پر ایمان لانا ہے جو نہ صرف ہمارا خالق اور رب ہے بلکہ وہ ہمارا حاکم بھی ہے۔ ہمیں خدا کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنی چاہیے جس کا حکم قرآن اور حدیث میں بیان ہوا ہے۔ میں نے تلخ تجربات سے یہ سیکھا ہے کہ عیاشی کا انجام ذلت ہے اور کوئی عظیم چیز ذاتی قربانی دیئے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی۔ ہم زندگی کے مقصد کو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتے جب تک ہم اپنی ذات سے باہر نکل کر نہ سوچیں۔

آپ کے خیال میں زندگی گزارنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ کسی چیز کی گہرائی میں نہ جایا جائے۔ آپ کو سطحیت سے بہت محبت ہے، اس لیے نہیں کہ آپ میں ذہانت کی کمی ہے بلکہ یہ رویہ خود ساختہ ہے۔ میرے لیے سب سے بڑی لذت تفکر میں ہے۔ ہر موضوع پر اتنا گہرا تفکر جتنا میرے بس میں ہو۔ اسی لیے مجھے تنہائی اور خاموشی پسند ہے اور میں

خلوت کو اتنی اہمیت دیتی ہوں۔ میں ہمیشہ معاملات کی گہرائی تک جانے کی عادی ہوں اور ان کے منطقی انجام تک غور وفکر کرتی ہوں۔ آپ زندگی کے سفر کے دوران زیادہ سے زیادہ آرام کے حصول کے متعلق سوچتے ہیں لیکن اس سفر کے انجام کے متعلق نہیں سوچتے۔ میں ہمیشہ زندگی کے سفر کے اختتام (موت) کے متعلق تفکر کرتی ہوں۔ میں اپنے آپ کو مسلسل یاددہانی کراتی ہوں کہ مجھے کسی بھی لمحے موت آ سکتی ہے اور میں دعا کرتی ہوں کہ روز قیامت میں اپنا حساب کامیابی کے ساتھ پیش کرسکوں..... بہت سا پیار مریم جمیلہ''

۱۸ مئی ۱۹۶۲ء کی شام کو چلا ہوا بحری جہاز جب وقت مقررہ پر کراچی کی بندرگاہ سے آ لگا تو مریم جمیلہ صاحبہ ڈھیلے ڈھالے لمبے سکرٹ کے ساتھ پورا پردہ کیے ہوئے آنکھیں تک چھپائے ہوئے باہر آئیں۔ کچھ دن کراچی ایک رکن جماعت کے ہاں قیام کیا۔ وہیں پر آپا جی ام زبیر اور آپا جی محمدی بیگم اور دیگر خواتین نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ دعوتیں کیں..... زاہدہ حمید کے ہاتھوں کا سلا ہوا سیاہ برقع جارجٹ کے نقاب والا اور چند نئے شلوار قمیص سوٹ بیگم عبدالحمید (محمدی بیگم صاحبہ) نے تحفتاً پیش کیے۔ سیاہ ریشمی برقع وصول کرتے ہی فوراً پہن کر آئینے کے سامنے اپنا جائزہ لینے لگیں اور خوشی سے سرشار ہوگئیں ..... اردو بہت تھوڑی آتی تھی۔ انگریزی نما اردو میں خوب پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اس میں ہاتھ آزاد رہتے ہیں ..... کتنے مزے کی بات ہے کہ میں سب کو دیکھ سکتی ہوں مگر کوئی مجھے نہیں دیکھ سکتا۔ کتنا خوبصورت ہے یہ پردہ کرنے کا لباس وغیرہ وغیرہ۔ بولنے میں کافی وقفہ دیتی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا سخت ذہنی دباؤ سے نکلی ہیں۔ کبھی خلاؤں میں گھورنے لگ جاتیں کبھی بات کرتے کرتے خاموش ہو جاتیں۔ بناتِ حمید خود اتنے تنگ اور فٹنگ والے کرتے قمیصیں پسند نہیں کرتی تھیں کہ ان کی تربیت ہی ایسی اچھی ہوئی تھی مگر ان کی قمیصوں کو پکڑ پکڑ کر کہتیں ''ٹائیٹ، ٹائیٹ'' مختلف گھروں میں دعوتوں کے سلسلہ میں آنا جانا رہتا تھا۔ ہر چیز غور سے دیکھا کرتیں۔ ایک دن کہنے لگیں ''صرف امۃ الوہاب اور محمدی بیگم کے گھر میں کوئی تصویر نہیں دیکھی۔'' کراچی کی خواتین بتاتی ہیں کہ مریم جمیلہ اپنے دین میں دیوانگی کی حد تک ڈوبی ہوئی تھیں۔

کراچی سے لاہور آئیں تو ظاہر ہے سیدھا مولانا مودودی کے گھر قیام کیا۔ مولانا صاحب بہت متاثر تھے کہ یہ بچی اتنی بڑی ہجرت کر کے آئی ہے۔ بیگم مودودی ان سے بہت لاڈ پیار کرتیں اور محترمہ حمیرا مودودی سے تو جلد ہی دوستی بھی ہو گئی یہاں انھیں بول چال کی آسانی تھی۔ انگریزی میں باتیں کر لیتی تھیں۔ سن لیتی تھیں۔ صحت تو خراب تھی ..... باتیں کرتے کرتے رک جاتیں۔ لکھنے پڑھنے کی مصروفیت زیادہ رکھی۔ چند ہی دنوں بعد ان کے رشتے کے سلسلہ میں ڈھیروں ڈھیر خطوط آنے لگے۔ بہت رشتے آئے۔ نواب بہاولپور کے داماد کا بھی رشتہ آیا مگر مولانا صاحب نے فیصلہ مریم جمیلہ صاحبہ پر چھوڑ رکھا تھا۔

اسی دوران پتوکی سے ایک مخلص رکن جماعت جو بہت

بڑے زمیندار تھے، نے مولانا صاحب سے گزارش کی کہ مجھے اللہ نے بیٹی نہیں دی صرف بیٹے ہیں میں مریم کو بیٹی بنا کر رکھوں گا۔ اسے مجھے دے دیں۔ چنانچہ مریم جمیلہ کو مولانا صاحب نے ان کے ساتھ بھیج دیا۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ بعد یہ واپس آ گئیں۔ شاید زبان کا مسئلہ آڑے آیا..... تنہائی کا شکار ہوئیں یا کیا بات ہوئی پھر اچھرہ میں مولانا صاحب کے ہاں رہنے لگیں۔ اسی دوران کچھ بیمار ہو گئیں اور ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا جہاں شعبہ خدمت خلق کے ناظم یوسف خان صاحب کی ڈیوٹی لگائی گئی ان کی عیادت اور ضروری اشیاء پہنچانے وغیرہ کی۔ ان کے چار بچے اور ایک بیوی تھی نہایت محبت وخلوص والا گھرانہ تھا..... مولانا صاحب بہت جلد مریم جمیلہ کی شادی کرنا چاہتے تھے تاکہ یہ اپنی نئی زندگی کا آغاز کر سکے۔ محترمہ حمیرا مودودی کا کہنا ہے کہ مریم نے خود خواہش کی تھی کہ میں کسی کنوارے کی بجائے شادی شدہ مرد سے نکاح کرنا چاہوں گی جس کے بچے بھی ہوں تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت پر بھی عمل کروں۔ چنانچہ مولانا صاحب نے محمد یوسف خان کے ساتھ ان کا نکاح کر دیا۔

شادی کے بعد جب پہلی بار مولانا صاحب کے گھر ملنے آئی ہیں تو گہرے عنابی رنگ کے بروکیڈ سوٹ میں نہایت پیاری لگ رہی تھیں نہ زیور، نہ میک اپ، نہ ایڑھی والا جوتا مگر چہرے پر ایک نور تھا۔ جاذبیت تھی۔ پاکستانی لباس ہمیشہ پہنا۔ کشمیری لڑکی کا گمان ہوتا تھا۔ لطف کی بات یہ کہ خان صاحب کی پہلی بیگم محترمہ شفیقہ نے خود مولانا صاحب سے جا کر مریم جمیلہ کا رشتہ اپنے میاں کے لیے مانگا تھا..... مولانا صاحب نے مریم کی رائے جاننا چاہی۔ مریم نے تین روز بعد فیصلہ دیا۔ ممکن ہے استخارہ کرنے میں یہ وقت لگا ہو۔

یوسف خان صاحب کو مولانا سے اتنی عقیدت تھی کہ ان کے بچوں کے نام پر اپنے بچوں کے نام رکھا کرتے۔ جب خان صاحب کے ہاں ساتواں بچہ آیا تو مولانا صاحب کہنے لگے میرے سب نام تو پورے ہو گئے۔ اب آپ اور کوئی نام سوچئے۔ خان صاحب کے ۹ بچے ہیں۔ خالد فاروق، حیدر فاروق، حلیمہ سعدیہ اور ماریہ خانم مریم جمیلہ سے اور پانچ بچے شفیقہ بیگم سے جو فی الواقع مریم جمیلہ کے لیے سراپا شفقت ثابت ہوئیں۔ اتنی محبت اتنا پیار کم ہی دیکھنے میں آیا ہے..... قدرت نے خان صاحب کے ساتھ مریم جمیلہ کا جوڑ جوڑا تھا تو اس میں نہ جانے کیا کیا حکمتیں ہوں گی..... سامنے کی حکمتیں تو ہم بھی جان گئے ہیں۔ اگر شفیقہ جیسا گھرانہ نہ ملتا تو شاید مریم جمیلہ تصنیف وتالیف کا اتنا کام نہ کر سکتیں۔ بڑی بیگم نے انھیں گھر داری، بچوں کی پرورش وغیرہ سے بالکل آزاد رکھا۔ چنانچہ مریم جمیلہ نے ان تمام بچوں کو پڑھانے کی ذمہ داری اٹھالی اور ساتھ ساتھ ۳۴ کتب تصنیف کر ڈالیں۔ لاتعداد خطوط ان کے علاوہ ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ایسی عالمہ فاضلہ خاتون پر ایم فل تو کیا پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا جانا چاہیے۔ ان کی اہم ترین کتب درج ہیں۔

(۱) اسلام ورسز دی ویسٹ (۲) اسلام اینڈ ماڈرن ازم (۳) اسلام ان تھیوری اینڈ پریکٹس (۴) از ویسٹرن سویلائزیشن یونیورسل؟ (۵) اسلام اینڈ اوری اینٹل ازم (۶) کوئسٹ فار دی ٹرتھ۔

ان کی ذاتی لائبریری بڑی قیمتی کتب پر مشتمل ہے۔ان کا خاندان ان کتب ، رسائل،خطوط اور اخباری تراشوں کو محفوظ رکھے گا۔اپنی نواسی معصومہ کے بارے میں مریم جمیلہ کہا کرتی تھیں کہ یہ میری لائبریری کی حفاظت کرے گی۔ نہایت صفائی پسند اور منظّم طبیعت پائی تھی۔مریم جمیلہ کا ذاتی کمرہ اور لائبریری دیکھ کر ہمارا اپنا دل ان پر ریسرچ کرنے کو مچل اٹھا۔ایک ایک خط،ایک ایک سطر سنبھال کر فائل میں رکھنے والی مریم جمیلہ،اسی طرح کا سارا ریکارڈ ،اپنی ساری کتب نیویارک کی اس لائبریری میں بھی رکھواتی رہی ہیں جہاں بیٹھ کر انھوں نے اسلامی علوم پر بہت مطالعہ کیا تھا۔

ہماری اس ناقابل فراموش دینی بہن نے زندگی بھر کسی کو تکلیف نہیں دی۔کسی سے کچھ طلب نہیں کیا.....بس اسلام کی طرف کسی سخت پیاسے شخص کی طرح لپکیں اور پھر سیر ہو کر جامِ اسلام سے .....شربت ایمان وعمل سے شاد کام ہوئیں .....ہم پیدائشی اور نسلی مسلمان خواتین و طالبات کے لیے بے شمار قابل عمل نکات ہیں ان کی خوبصورت زندگی کی کہانی میں .....اسلام کی صحیح قدر و قیمت کسی نومسلم سے پوچھئے ..... دین اسلام کی یہ حقیقی قدر دان .....حب الٰہی سے سرشار..... نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ومحبت میں گرفتار ..... جس کے بارے میں کوئی سال بھر پہلے خاندان کے ایک نیک بخت شخص کو خواب میں آ کر حضورؐ نے ایک نہایت خوبصورت لباس دیتے ہوئے فرمایا۔''یہ مریم جمیلہ کو پہنا دو اور اس کا خیال رکھو۔''

اللہ رب العالمین کی یہ مومن بندی ..... رسول رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی قابل فخر امتی ۱۴ ذوالحجہ کو نہایت آرام سے ۸۷ برس کی عمر میں ..... خاموشی سے اگلے اور دائمی جہاں کی طرف منتقل ہو گئیں۔عید قربان کے دن اسلام قبول کیا.....عید قربان کے مہینے میں یہاں سے چل دیں۔ ان کی اپنی زندگی بھی تو سراپا قربانی تھی۔ دو تین دن پہلے روپ کچھ سوا ہو گیا تھا۔ وقت رخصت بھی بہت سکینت اور نور تھا چہرے پر.....ایک بڑے جنازے اور لاتعداد دعاؤں کے ہمراہ لحد میں اتاری گئیں۔نمازِ عصر کے بعد۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ماخذ: اس مضمون کی تیاری میں درج ذیل شخصیات کی ممنون ہوں: (۱) محترمہ حمیرا مودودی صاحبہ (۲) محترمہ ماریہ خانم صاحبہ (بنت مریم جمیلہ) (۳) محترمہ سلمٰی حمید صاحبہ (۴) محترمہ شائستہ عباسی صاحبہ (۵) محترمہ سعدیہ مشتاق گوہر صاحبہ (ان کی ترجمہ کردہ کتاب ''حق کی تلاش'' از مریم جمیلہ میرے لیے بہت معاون ثابت ہوئی۔ جزاکم اللہ خیراً۔(ف۔چ)

☆☆☆

# میری والدہ

## جو مریم بھی تھیں اور جمیلہ بھی

میری والدہ محترمہ مریم جمیلہ جنھیں سب ''آپا'' کہتے تھے اپنے خاوند کی دوسری بیوی تھیں۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۸۷ سال تھی۔ انھوں نے اٹھائیس سال کی عمر میں نیویارک میں اسلام قبول کیا اور قبولِ اسلام کے بعد اپنی باقی زندگی اسلام کی اشاعت کے لیے وقف کر دی۔

وہ کون تھیں؟ کہاں کی رہنے والی تھیں؟ اُن کا خاندان کیا تھا؟ اُن کو اسلام سے کیسے واقفیت حاصل ہوئی؟ اسلام کیسے قبول کیا؟ پاکستان کیسے آئیں؟ اور پھر ابا جان سے اُن کی شادی کیسے ہوئی؟ شادی کے بعد اُن کا کبھی بھی امریکہ واپس نہ جانا اور ہمیشہ کے لیے پاکستان کو اپنا دائمی گھر بنانا۔ ان سب سوالات کے جوابات ہمیں اُن کی کتب

1. Correspondence between Syyed Mododi and Maryam Jameelah (مراسلت)

2. Memories of Childhood and youth in America (حق کی تلاش)

3. At home in Pakistan

میں تفصیل سے ملتے ہیں جن کا اردو ترجمہ موجود ہے۔ ایک بیٹی ہونے کی حیثیت سے جب میں اُن کی زندگی پر ایک نظر ڈالتی ہوں تو نہ صرف وہ ایک بہترین ماں نظر آتی ہیں بلکہ عورت کے جس روپ میں اُنھیں دیکھیں اس میں وہ پوری اترتی نظر آتی ہیں۔ پڑھا لکھا طبقہ انھیں صرف اُن کی تحریروں کی بدولت جانتا ہے۔ یہاں میں اُن کی گھریلو زندگی کے بارے میں لکھنا چاہتی ہوں جو سب سے مخفی تھی۔

وہ شروع ہی سے تنہائی پسند تھیں۔ ہر وقت کتب کا مطالعہ اور خطوط کے جوابات دینے میں مصروف نظر آتی تھیں۔ وہ ایک بہت اچھی ٹائپسٹ تھیں جن کے ہاتھوں نے ہزارہا ورق لکھے۔ وہ اپنے سارے خطوط کے جوابات خود ٹائپ کرتیں اور اسلام پورہ کے ڈاک خانے میں خود ڈال کر آتیں۔ اب جبکہ میں اُن کے بارے میں لکھنے بیٹھی ہوں تو مجھے قریباً تیس سال پیچھے جانا پڑے گا۔

سب سے چھوٹی بیٹی ہونے اور شادی کے بعد خوش قسمتی سے سسرالی گھر پاس ہونے کی وجہ سے مجھے سب سے زیادہ اُن کے قریب رہنے کا موقع ملا۔ انھوں نے نبی کریمؐ کے اس فرمان کے مطابق عمل کیا کہ انسان کو اس دنیا میں ایک مسافر کی طرح زندگی گزارنی چاہیے جو کچھ دیر کے لیے ایک درخت کے نیچے آرام کے لیے بیٹھتا ہے اور پھر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ اُن کے کمرے کو دیکھ کر مجھے صحابیات رضی اللہ عنہن کا دور یاد آتا ہے۔ کتب میں تو میں صحابہؓ اور صحابیاتؓ کے بارے میں پڑھتی تھی لیکن اس

معاملے میں وہ میرے لیے عملی نمونہ تھیں۔ بالکل یہی بات ایک فوجی افسر (عبدالحمید احمد، مسلم ٹاؤن راولپنڈی) نے اپنے ۲۵ ستمبر ۲۰۱۲ء کے خط میں امی کو لکھی جو کہ اردو زبان میں لکھا گیا تھا اور اس کی خاص باتیں میں نے آپا کو انگریزی ترجمہ کے ساتھ سنائیں۔ عبدالحمید میری والدہ کو لکھتے ہیں۔

''آپ کی کتاب ''حق کی تلاش'' اب مجھے ملی جس کو میں کئی بار پڑھ چکا ہوں۔ یہ پڑھ کر میں بہت رویا ہوں لیکن اس کتاب نے میری ''بیٹری'' گویا ''چارج'' کر دی ہے۔ آپ نے اس کو لکھ کر ایک نیکی کی بلاشبہ، اور مسز سعدیہ گوہر نے جیسا ترجمہ کر ڈالا وہ بھی اعلیٰ ترین ہے۔ آپ تو ہمیں ایسے دور میں لے گئیں جیسا دور رسولؐ اللہ کی آمد پر تھا۔ آپ نے لوگوں پر شفقت کی یہ کتاب لکھ کر۔ میں اس کو بار بار پڑھوں گا جب تک مجھے حوصلہ نہ مل جائے۔ ایک عجیب سی خوشی اور ایک میٹھا سا درد ہے جو میرے وجود میں پیدا ہو گیا ہے..... یہ الفاظ میں نے بڑی مشکل سے لکھے۔ دل اتنا کچھ کہنا چاہتا ہے کہ کتاب بن جائے۔ آپ نے ایک آگ بھڑکا دی۔''

خط تو آپا کو بہت آتے تھے لیکن زیادہ تر انگریزی میں ہی ہوتے تھے اس خط کو میں نے خود بھی بار بار پڑھا اور اس بات پر خوب روئی کہ میری والدہ کی تحریر میں بہت اثر ہے۔ اُن کے تجربات میں اثر ہے۔ میں نے عبدالحمید کا خط اپنے ابا جان کو پڑھ کر سنایا اور دوسروں کو پڑھنے کو دیا۔ اللہ پاک ہمیں بھی ایسا بنا دے (آمین)۔

اب دوبارہ اُن کے کمرے کی طرف آتی ہوں جس میں ایک پلنگ، کرسی اور میز ہے۔ میز پر اُن کا ٹائپ رائٹر ہے۔ ایک جائے نماز ہے، ایک لکڑی اور جالی سے بنی ہوئی الماری ہے۔ کمرے کی دیواروں پر قرآنی آیات کے فریم آویزاں ہیں۔ جب انسان کمرے میں داخل ہوتا ہے تو سب سے پہلے دیواروں پر نگاہ جاتی ہے۔ ایک بڑا سا فریم ہے جس پر پورا قرآن پاک لکھا ہوا ہے۔ کمرہ ہر وقت بالکل صاف ستھرا ہوتا۔ کوئی بھی چیز ادھر سے اُدھر پڑی مجھے کبھی بھی دکھائی نہیں دی۔ ایک کمرے میں ابا جان نے لکڑی کی بڑی الماریاں بنوا دیں جس میں آپا نے اپنے پیارے ماں باپ، عزیز و اقارب، سہیلیوں اور دنیا جہان سے آئے ہوئے خطوط بڑے قرینے سے فائلوں میں لگائے ہوئے ہیں۔ کتابیں اُن کی جان تھیں۔ کتابوں سے بہت محبت تھی وہ ایک علم کا سمندر تھیں جس کا کوئی کنارہ نہیں تھا۔ وہ نہایت قرینے سے اپنی ان دس الماریوں میں اپنی کتابوں کو رکھتی تھیں۔

جب بھی review کے لیے اُن کے پاس کوئی کتاب آتی تھی وہ پڑھنے کے بعد سب سے پہلے اُس کی جلد بندی کرواتیں اور اس پر خاکی کاغذ چڑھاتیں۔ بعد میں باہر کی طرف کتاب کا نام لکھتیں اور اپنے نام کا Tag اندر کی طرف لگاتیں۔ آج ۶۰ سال گزرنے کے باوجود اُن کی ہر کتاب نئی معلوم ہوتی ہے۔

اُن کے خطوط دنیا کے ہر کونے سے آتے جنھیں وہ سفید

کاغذات کی ایک بائنڈنگ کروا کے اس میں گوند سے چپکا دیتیں۔ پھر خاص خاص خبریں ۱۹۶۲ء سے ۲۰۱۲ء تک آتی رہیں، اُن کے اخبارات اپنے پاس محفوظ کر کے اُن کی جلدیں کرواتیں۔ ہر خاص خبر کا اُن کے پاس ریکارڈ موجود ہے۔ یہ سب چیزیں ہمارے لیے قیمتی اثاثہ ہیں۔غرض جس جس شخص سے اُن کا تحریری رابطہ رہا وہ اُن کی لائبریری کا حصہ بنتا گیا۔

مجھے یاد ہے کہ روزانہ کوئی نہ کوئی خط یا ایک دن چھوڑ کر ان کے نام ''ڈاکیا'' خط اور بہت سی کتب اور رسائل لاتا تھا۔امی کا کمرہ گلی کے ساتھ ہی تھا۔ڈاکیا آواز لگاتا ''مریم'' اور امی اوپر سے تیزی کے ساتھ اترتیں اور اپنی ڈاک خود وصول کرتیں۔ بعد میں میں نے ہوش سنبھالا اور دیکھا کہ اس چیز کے آنے سے امی کو اتنی خوشی ہوتی ہے تو میں بھاگ کر جاتی۔ڈاکیے سے خطوط وصول کرتی امی کی طرف یہ کہتی ہوئی بھاگتی ''آپا ڈاکیا ڈاک لایا.....ڈاکیا ڈاک لایا'' میری امی کی خوشی دیکھنے والی ہوتی تھی۔ ڈاک اُن کی خوراک تھی۔ جس دن ایسی ڈاک آتی جس میں اُن کی دلچسپی کی کتابیں ہوتیں اور اُن کی بہت ہی پرخلوص سہیلیوں کے خطوط ہوتے جن کا اُن سے زندگی کے آخری عمر تک رابطہ رہا تو وہ بہت خوش ہوتی تھیں۔اس دن انھیں کھانے پینے کا کوئی ہوش نہ ہوتا تھا۔وہ نبی کریمؐ کے اس فرمان پر بھی پوری اترتی تھیں کہ ''رحم'' رحمٰن کی ایک شاخ ہے۔ انھوں نے اس قول کو نہ صرف خود اپنایا بلکہ عملی طور پر اپنے بچوں میں بھی اسے داخل کر دیا۔

اُن کی امریکہ سے پاکستان ہجرت کا آخری خط جو Memories of childhood and youth in America میں شامل ہے،اس کا ایک ایک لفظ دل پر اثر کرنے والا اور رلا دینے والا ہے۔جس میں انھوں نے اپنے ماں باپ سے وعدہ کیا کہ وہ دور ضرور جا رہی ہیں لیکن انھیں لمبے لمبے خط لکھ کر ہر حقیقت سے آگاہ کرتی رہیں گی۔اس لیے اُن کے خطوط میں یہ چیز پاکستان آنے کے بعد ہر جگہ نظر آتی ہے۔ جب تک اُن کے والدین حیات رہے انھوں نے تفصیل سے انھیں اپنی زندگی کے تجربات لکھے اور ایسے لکھے کہ جیسے اب بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ایک فلم چل رہی ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے وہ ہمیں اپنے پاس بٹھا کر اپنے اماں ابا کو خط لکھتیں۔ ہماری آوازیں ٹیپ کر کے بھیجتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں پہلی مرتبہ ۱۹۹۲ء میں امریکہ گئی اور اپنے نانا اور خالہ سے ملی تو میرے اندر ان لوگوں کے لیے وہی محبت تھی جو ایک خونی رشتے میں ہوتی ہے۔نانا اور خالہ بھی کہتے تھے کہ ایسا لگتا ہے کہ ''مریم'' آئی ہے۔ انھوں نے اولڈ ہوم (فلوریڈا) میں مجھے سب سے ملوایا اور کہا کہ میری نواسی پاکستان سے آئی ہے۔

امی کو میں نے ہوش سنبھالتے ہی سر پر سفید ململ کا دوپٹہ لیتے دیکھا۔ میں نے کبھی بھی اُن کا سر ننگا نہیں دیکھا۔ وہ اچھے اور تیز رنگ کے کپڑے پہننے کی شوقین تھیں۔ جوتا اُن کا سادہ ہوتا تھا۔ کپڑے ڈھیلے ڈھالے ہوتے تھے۔

جب تک وہ گھر سے باہر نکلتی رہیں وہ برقع لے کر جاتی تھیں۔ ابھی وفات سے کچھ دن پہلے پوچھ رہی تھیں کہ میرا برقع اِدھر ہی لٹک رہا ہے نا۔ اللہ پاک نے زندگی کے آخری لمحے تک ان کی صحت اچھی رکھی۔ انھیں ہر طرح کی بیماری سے دور رکھا۔ وہ کم بولتی تھیں۔ ہمیشہ کام کی باتیں کرتیں۔ کبھی کبھی میرے سامنے نبی کریمؐ کے دور کا ذکر کرتیں۔ انھیں صاف ستھرا رہنا اور اپنے پلنگ کی چادر کو صاف رکھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ باقاعدگی سے غسل لیتی تھیں۔ نماز سے پہلے وضو کر لیتی تھیں۔ چھوٹے ہوتے مجھے یاد ہے کہ اُن کی جالی کی الماری میں ایک چمڑے کا گرے رنگ کا بیگ ہوتا تھا جس میں ہر سائز کی چھوٹی چھوٹی روئی کی گدیوں پر سوئیاں لگائی ہوتی تھیں۔ وہ اپنی بہت سی ضرورت کی چیزیں اپنے ہاتھ سے سلائی کرتی تھیں۔ ابا جان نے انھیں اپنانے کے بعد اُن سے کھانا وغیرہ کبھی نہیں پکوایا۔ وہ صرف اپنے لیے چائے بنا لیتی تھیں۔ ابا جان اور میری دوسری امی (شفیقہ) اللہ پاک اُن پر رحمتوں کی بارش کرے (آمین) کو پتہ تھا کہ آپا کے ہاتھ صرف لکھنے کے لیے ہیں۔ کبھی کسی نے اعتراض کیا ہی نہیں تھا کہ وہ گھر کا کام کیوں نہیں کرتیں۔ اس بات کو لکھتے ہوئے اگر میں اپنی پہلی امی جنھیں سب امی ہی کہتے تھے کا ذکر نہ کروں تو ناانصافی ہوگی۔ میری پہلی امی میرے نزدیک آپا سے بڑھ کر عظیم خاتون تھیں۔ بہت صابر و شاکر تھیں۔ انھیں مجھ سے اور مجھے اُن سے بہت انس تھا۔ ان دونوں میں دو تین چیزوں کی بھی مماثلت تھی۔ پہلی امی کی پیدائش کا وہی سال تھا جو میری آپا کا ہے۔ اُن کی بھی دو بہنیں اور کوئی بھائی نہ تھا۔ میری آپا کی بھی دو بہنیں اور کوئی بھائی نہ تھا۔ دونوں کی طبیعتیں بہت حد تک ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھیں۔ ابا جان نے دونوں کے درمیان توازن رکھا اور دونوں بیویوں کا ذکر کرتے ہوئے میرے ابا جان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ دل بھر جاتا ہے اور کہتے ہیں کہ میرا گھر جنت کے باغوں میں سے ایک گھر ہے۔ میری امی اور اُن کی سب سے بڑی بیٹی ''حمیرا خانم'' نے مل کر ہم بہن بھائیوں کی پرورش کی۔ ہمارا بہت خیال رکھا۔ اس طرح اس گھر میں ''آپا'' کو نہایت اطمینان اور سکون کے ساتھ اسلام کی خدمت تحریری طور پر کرنے کا بہت زیادہ موقع ملا۔ یہ اللہ پاک کا خاص کرم تھا کہ اُس نے ایک دوسرے کے بچوں میں ادب و احترام اور محبت و پیار ڈالا۔

آپا نے مجھے کبھی بھی نصیحت نہیں کی وہ ہر لمحہ میرے لیے عملی نمونہ رہیں وہ جیسا لکھتی تھیں اس کی عملی تفسیر تھیں۔ ابا جان کی اطاعت دل و جان سے کرتی تھیں اور اُن کی ایک ہی آواز پر Yes Khan Sahab کہتیں۔ دونوں میں بہت محبت تھی۔ پہلی امی ۱۹۹۵ء میں وفات پا گئی تھیں۔ جب ابا جان بیمار ہوئے تو آپا مجھے اکثر کہا کرتی تھیں ماریہ:

"He is te ruler of te house. Give him the best food. Do whatever Khan sahab says."

۲۰۱۱ء میں انھی دنوں میں ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے انھیں ہسپتال لے جایا گیا۔ اس درمیانی عرصے کے دوران

وہ بالکل صحت یاب رہیں۔اپنا کام کرتی رہیں۔اُن کی قریباً ہر دعا قبول ہوئی۔ جو ڈاک آنی تھی وہ اُن کی زندگی میں اُن کو مل گئی اور جن کو کچھ لکھا ہوا تھا وہ اُنھیں مل گیا۔ستمبر ۲۰۱۱ء سے لے کر اس اکتوبر تک الحمدللہ میرا معمول رہا کہ روزانہ باقاعدگی سے اُن سے ملنے اور باتیں کرنے جاؤں۔ میں کئی مرتبہ اُن کے پلنگ کے پاس کرسی پر بیٹھ کر اُن کی بہترین قلمی سہیلی فاطمہ گریم کے خطوط پڑھتی جو ایک جلد کی صورت میں موجود تھے۔ایک اور امی کی بہترین سہیلی زیبا صدیقی جن کا تعلق امریکہ سے تھا اُن کا تذکرہ ہوتا۔ فاطمہ گریم جرمنی سے تعلق رکھتی تھیں اور یہ دونوں نومسلم سہیلیاں تھیں جن کا میری آپا سے ۱۹۶۳ء سے رابطہ تھا۔ایک بہت ہی پیاری سہیلی جو ناروے سے تعلق رکھتی ہیں وہ Angella ہیں۔ اُن کے آپا کو باقاعدگی سے بہت سے محبت بھرے خطوط آتے۔ فارغ وقت میں آپا زیادہ تر اپنے اوپر لکھی جانے والی کتاب "The Convert" کا مطالعہ کرتیں یا ایک کتاب اُنھیں بہت پسند تھی جس کا نام تھا "The Stranger my son"۔اس کی خاص بات میری آپا نے مجھے بتائی کہ یہ ایک حقیقی کہانی ہے جو ایک ماں نے اپنے بچے پر لکھی ہے جو اُس کے باقی بچوں سے بہت مختلف ہے۔آپا بتاتیں یہ کہانی اور اس میں ماں باپ میری زندگی کے بہت قریب ہیں۔

آپا کی زندگی کا ایک ایک پہلو میرے لیے رہنمائی فراہم کرتا ہے۔نماز کو وقت پر پڑھتی تھیں۔ظہر،عصر،مغرب اور عشاء کی نماز ابا جان کے ساتھ باجماعت پڑھتی تھیں۔

اب ابو بہت اونچا سنتے ہیں جیسے ہی اذان شروع ہوتی آپا وضو پہلے ہی کر کے رکھتیں اور ابا جان سے کہتیں ''خان صاحب اذان ہو گیا'' یہ ان کا معمول رہا کہ عصر کی نماز کے بعد ابا جان کے پیچھے پیچھے قرآن پڑھتیں۔ مجھے اُن کا اپنی زبان میں قرآن پاک پڑھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ابا جان سے قرآن پڑھنے کے بعد وہ اپنا محمد مارماڈیوک پکتھل کا انگریزی قرآن پاک اٹھاتیں۔اُن آیات کا ترجمہ پڑھتیں جو وہ ابا جان سے سبق لیتی تھیں۔ پھر وہ بعض اوقات ابا جان سے اُسی موضوع پر بات کرتیں مثلاً جب سورہ ہود پر پہنچیں تو کہا کہ یہ وہ سورت ہے جس کے بارے میں نبی کریمؐ نے فرمایا کہ اس نے مجھے بوڑھا کر دیا۔سورہ طٰہٰ پر پہنچیں تو کہا کہ یہ سورت کی تلاوت سن کر حضرت عمرؓ مسلمان ہوئے۔جس دن ابا جان بیمار ہوتے یا طبیعت کی خرابی کی وجہ سے قرآن پاک نہ پڑھا سکتے اور اکٹھے نماز نہ پڑھ سکتے۔اس دن بہت اداس ہوتیں اور کہتیں مجھے خان صاحب کی بہت فکر ہے۔ دعا میں سب سے پہلے خان صاحب کے لیے دعا کرتیں کہ اللہ پاک انھیں اچھی صحت دے اور ان کی یادداشت اچھی رکھے۔

آپا کو پاکستان سے بہت محبت تھی۔۱۴ اگست سے ایک دن پہلے وہ خود پاکستان کا جھنڈا چھت پر لہرانے کے لیے بھائی کو دے دیتیں۔انھوں نے اردو لکھائی بھی سیکھی اُن کی اردو لکھائی میں ذرا سی بھی بے ترتیبی نظر نہیں آتی۔ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی اردو کی پہلی چار کتابیں انھوں نے نہ صرف پڑھیں بلکہ اُن کو اپنی کاپی میں اتارا۔ جب تک وہ خود

اسلام پورہ خطوط پوسٹ کرنے جا سکتی تھیں اور خود جلدیں کرواسکتی تھیں کرواتی رہیں بعد میں پہلی امی کے بیٹے حسن فاروق خان کی اہلیہ مون کے ساتھ رکشے میں بیٹھ کر خود بائنڈنگ کے لیے جاتیں۔ اپنے ڈاکیے اور بک بائنڈر کا خاص طور پر حال پوچھتیں۔ عید پر ڈاکیے کی عیدی کا خاص خیال رکھتیں۔

آپا کو کھانے میں آملیٹ بہت پسند تھا۔ دہی، ابلا ہوا انڈا، دودھ، قیمہ، آلو کے کباب اُن کو بہت مرغوب تھے۔ اُن کو مون کے بنائے ہوئے آلو کے کباب بہت پسند تھے۔ صبح کا ناشتہ گندم کا دلیہ ہوتا جو روزانہ حسین بھائی پورے آٹھ بجے انھیں دے دیتے۔ عصر کی چائے وہ ابا جان کے ساتھ ہی لیتی تھیں۔ جب ابا جان کو عصر کے وقت پہلے دودھ دیتے تو ہمیشہ وہ یہی کہتے کہ پہلے مریم کو دو۔ ابا جان اپنی پلیٹ میں سے سب سے بہترین بوٹی میری آپا کے لیے الگ کر دیتے اور انھیں دیتے۔ رات کھانے کے بعد روزانہ بڑے بھائی احمد فاروق خان کی اہلیہ سائرہ انھیں چائے دیتیں۔ ایک مرتبہ آپا سیڑھیوں سے گر گئیں۔ سر پر چوٹ لگنے کی وجہ سے پانچ چھ ٹانکے لگے۔ آپا کو ہسپتال لے کر جانے کے لیے مجھے جب بھی کسی کی ضرورت پڑی میرے سب سے بڑے بھائی عمر فاروق خان میرے ساتھ ہوتے جس سے مجھے بہت حوصلہ ہوتا۔ میرے اپنے بھائی باہر تھے لیکن ان بہن بھائیوں کے ہر لمحے کے ساتھ نے میرے لیے الحمدللہ بہت سی آسانیاں پیدا کیں جس کے لیے میں اپنے رب کی بہت شکر گزار ہوں۔

میری سب سے بڑی بیٹی معصومہ سے انھیں بہت لگاؤ تھا۔ وہ اس کے لیے بھی باہر سے کہانیوں کی کتابیں منگواتیں اور پڑھنے کو دیتیں۔ اُن کے پیار کے اظہار کا طریقہ ہاتھ کو الٹا کر کے اُسے چومنا تھا اسی طرح جب میں نے اُن کے پاس سے رخصت ہونا ہوتا تو میں اُن کے ہاتھ کو چومتی۔ میری طرح دوسری بہنوں کے بچے اور بچیوں سے انھیں محبت تھی۔ حمیرا خانم کی بیٹی منیٰ فاطمہ، اسماء خانم کے بیٹے احد علی اور میمونہ کے بیٹے فیصل خان سے وہ بہت مانوس تھیں۔ بچوں کو بھی وہ ویسا ہی لمبا اور بہت محبت بھرا خط کا جواب دیتیں جیسے وہ بڑوں کو دیتیں۔ میری اپنی بڑی بہن حلیمہ سعدیہ جو کہ فیصل آباد میں رہتی ہیں ان سے خطوط کے ذریعے مسلسل رابطہ رہتا تھا۔ اُن کے بچے بھی آپا کو خطوط لکھتے۔ اُن خطوط کے جواب وہ اپنی پیاری صاف ستھری لکھائی میں دیتیں۔ غرض خاندان کے ہر فرد کو اُن کی پسند اور ناپسند کا علم تھا۔ بچے بچے کے دل میں اُن کا ادب واحترام تھا۔

اُن کا کمرہ بالائی منزل پر تھا۔ لمبی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے میرے قدم تیزی سے اپنی آپا کے کمرے کی طرف بڑھتے اور میں نے وہیں سے انھیں پکارنا ''السلام علیکم آپا'' وہ کہتیں ''وعلیکم السلام'' Maria I was just waiting for you. I was missing you. you came late today." گھر کا کام جلدی جلدی نمٹا کر میں نے اپنی امی کے گھر کی طرف تیزی سے نکلنا کہ وہ میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ مجھے روزانہ اُن کے پاس جانا،

پاس بیٹھنا، ان کی طرف پیار سے دیکھنا اور اُن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینا بہت اچھا لگتا تھا۔ آج بھی اُن کے جانے کے بعد اُن کے ہاتھ کا لمس میں اپنے ہاتھ پر محسوس کرتی ہوں یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس دنیاوی زندگی میں اب میں کبھی بھی اُن ہاتھوں کو چھو نہ پاؤں گی۔ اپنی آخری عمر میں وہ بہت مطمئن تھیں اور انھوں نے اس کے لیے شروع ہی دن سے تیاری کر رکھی تھی جس میں دن گزرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

وہ مجھ سے اکثر کہا کرتی تھیں ''ماریہ میرا یہ وقت زندگی کا سب سے بہترین وقت ہے جبکہ خاندان کے سب افراد مجھے بہت پیار کرتے ہیں، میری عزت کرتے ہیں۔ میں نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا کہ میرا پاکستان آنے کا فیصلہ غلط تھا۔ اللہ پاک کا شکر ہے یہ خاندان بہت اچھا ہے۔ اس کی لڑکیاں بہت اچھی ہیں جو اپنے بزرگوں کو سنبھالتی ہیں۔''

وہ الحمدللہ کا لفظ بہت استعمال کرتیں۔ ماں باپ سے ملنے کے بعد میں ہمیشہ اپنے گھر کی طرف ایک نئے جوش اور ولولے کے ساتھ لوٹتی۔ روزانہ والدہ کو جا کر ملنے میں میرے میاں، میرے تمام گھر والوں اور بچوں کا الحمدللہ تعاون شامل حال رہا جس کے لیے میں اپنے رب کی بہت بہت تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

اسلام پورہ ڈاک خانے کی طرف جاتے ہوئے راستے میں میرا گھر پڑتا ہے۔ وہ ہفتے میں ایک بار ضرور آتے وقت میری طرف بیٹھتیں۔ انھیں سکنجبین بہت پسند تھی۔ انھیں میری ساس سے بھی خاص انسیت تھی۔ میری ساس مرحومہ (رفیعہ بیگم) بھی اُن کا بہت احترام کرتی تھیں۔ امریکہ میں مقیم حیدر بھائی اُن کے وہ خطوط جو اُنھیں لکھے گئے تھے اُن میں دیکھ رہے تھے کہ ایک بھی خط ایسا نہیں تھا جس میں انھوں نے اپنے لیے کسی بھی قسم کی کوئی فرمائش کی ہو۔ سوائے کوئی کتاب جو انھیں یہاں نہ ملتی وہ بھائیوں سے کہتیں جو وہ فوراً انھیں بھیج دیتے۔ وہ اپنے بچوں کے لیے بڑی بڑی ڈگریاں نہیں چاہتی تھیں بلکہ وہ انھیں عملی طور پر ایک اچھا مسلمان دیکھنا چاہتی تھیں۔ جب وہ دہشت گردی کے واقعات اخبار میں پڑھتیں تو مجھ سے کہتیں ''ماریہ ہمیں دہشت گرد اور مجاہدین میں فرق رکھنا چاہیے۔ اسلام میں بہت بڑے بڑے مجاہدین گزرے ہیں۔ انھوں نے کبھی کسی مظلوم عورت پر ہاتھ اٹھایا نہ ہی کسی بچے کو قتل کیا۔''

وفات سے دو روز پہلے میرے بڑے بھائی احمد فاروق خان سے کہنے لگیں ''احمد! میرا جنازہ شریعت کے مطابق کرنا۔ مجھے اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ دفنانا۔ یعنی شفیقہ، محمد فاروق (پہلی امی کا مرحوم بیٹا) کا بھائی (شیر افگن) جو حمیرا خانم کے شوہر تھے اور ماریہ اور معصومہ میری لائبریری کی حفاظت کریں۔''

اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ نہ صرف مجھے بلکہ میرے خاندان کے ہر فرد کو اپنی رضا کے مطابق بنا دے۔ ہمیں اپنی والدہ کے لیے صدقہ جاریہ بنا دے۔ ہمیں اُن کا کام سنبھالنے کی توفیق عطا فرما دے (آمین) اللہ پاک میری والدہ کی مغفرت کرے انھیں علیین میں شامل کرے، انھیں جنت الفردوس میں داخل فرمائے (آمین ثم آمین)۔

☆☆☆

# مسلمان عورت مظلوم نہیں ہے

## گیلپ سروے کی تازہ تحقیق

مسلمان خواتین برملا اس سوچ کی نفی کرتی ہیں کہ ان کو مسلم معاشرے میں ثانوی حیثیت دی جاتی ہے اور ان کو اس دوسرے درجے کی کمتر حیثیت تسلیم کرنے کیلئے ابتدا ہی سے ذہنی طور پر تیار کیا جاتا ہے، اور نہ ہی وہ کسی طور پر اپنے آپ کو مظلوم تصور کرتی ہیں۔

ان خیالات کا اظہار حال ہی میں مشہور زمانہ این جی او گیلپ آرگنائزیشن کی طرف سے کئے گئے ایک سروے میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی مسلمان خواتین نے کیا۔اس بات کا اندازہ لگانے کے لیے کہ مسلمان عورت کیا چاہتی ہے، ۲۰۰۵ میں مشرق وسطیٰ میں کیے گئے ایک سروے کے مطابق مسلمان خواتین کی ایک غالب اکثریت کا مطالبہ ہے کہ ان کو بغیر کسی معاشرتی دباؤ کے آزادنہ حق رائے دہی یعنی ووٹ کا حق حاصل ہونا چاہیے۔اور اس کے ساتھ ساتھ ان کو گھر سے باہر نکل کر کام کرنے کی، حتیٰ کہ سرکاری ملازمتوں اور اعلیٰ ترین حکومتی مناصب پر بھی ذمہ داریاں ادا کرنے کی اجازت اور حق حاصل ہونا چاہیے۔اس کے علاوہ آٹھ مسلم اکثریت والے ممالک میں آٹھ ہزار سے زائد مسلم خواتین کے انٹرویو دوبدو ملاقاتوں میں کیے گئے، جن کے ذریعے یہ واضح رائے سامنے آئی کہ مسلم دنیا کی بیشتر خواتین کے نزدیک صنفی بنیادوں پر استحصال کا کوئی مسئلہ انہیں درپیش نہیں ہے بلکہ ان کو اس سے کہیں شدید تر مسائل کا سامنا ہے، جو ان کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور وہ ترجیحی بنیادوں پر ان کو حل کرنا چاہتی ہیں۔

جب ان خواتین سے پوچھا گیا کہ انکو اپنے معاشرے میں کون سی چیز سے سب سے زیادہ اختلاف ہے، تو ان کی اکثریت کا ماننا یہ تھا کہ مسلمان ممالک کے مابین اتحاد کی کمی، متشدد انتہا پسندانہ رجحانات اور سیاسی و معاشی انحطاط ان کے لئے باعثِ تشویش ہیں، یہ مسائل ان کے نزدیک تباہ کن اور سنگین ہیں۔اس کے برعکس حجاب، نقاب، برقعہ، سکارف، پردہ.....یعنی وہ علامات جن کو مغرب کی نظر میں مسلمان عورتوں پر ظلم ڈھانے والے ہتھیار سمجھا جاتا ہے، تجزیہ نگار حیران ہوئے جب ایسی کسی بات کا تذکرہ تک بھی خواتین سے پوچھے گئے سوالات کے جواب میں نہ مل سکا۔

خواتین کے حقوق سے متعلق مجموعی طور پر رائے کا اظہار کرنے والی اکثر خواتین نے ''مساوات مرد و زن'' کو مغربی معاشرے کے ساتھ وابستہ کیا۔ مراکش کی ۷۸ فیصد، لبنان کی ۷۱ فیصد اور سعودی عرب کی ۴۸ فیصد خواتین کی رائے میں قانونی مساوات مغربی معاشرے کا خاص وصف ہے۔ حیرت ا

س بات پر ہے کہ اس سب کے باوجود بھی ان خواتین کے خیال میں مغربی اقدار و روایات کو اپنانا، مسلم دنیا کی سیاسی ومعاشی ترقی کا ضامن نہیں ہوسکتا۔

جب ان خواتین سے پوچھا گیا کہ ''مغربی معاشرے کی کون سی بات آپ کو سب سے زیادہ معیوب محسوس ہوتی ہے؟'' تو اس سوال کے جواب میں اکثر خواتین کی رائے یہی تھی کہ مغربی معاشرے کا اخلاقی انحطاط، بالخصوص اختلاطِ مرد وزن اور فحش وعریاں انڈسٹری خطرناک حد تک تباہ کن ہے، اور انکے ذریعے خاص طور پر عورت کے تقدس کو پامال کیا جارہا ہے اور عورت کا ایک Hollywood Image پیش کیا جارہا ہے، جس کو ان خواتین نے (glamorous) مصنوعی مسحور کن کا نام دیا۔

رائے دینے والی اکثر خواتین کے نزدیک ان کے اپنے معاشروں کا جو پہلو ان کے نزدیک سب سے زیادہ قابل قدر ہے وہ ان کا اپنی اخلاقی اور روحانی اقدار سے مربوط تعلق کا استوار ہونا ہے۔ رائے دینے والی ۵۳ فیصد پاکستانی خواتین کا ماننا تھا کہ ان کے نزدیک ان کے معاشرے کی سب سے نمایاں خوبی، افراد کا اپنے مذہبی عقائد سے خاص لگاؤ ہے۔ اسی طرح مصر میں رائے دینے والی ۵۹ فیصد خواتین نے بھی اپنے مذہب سے محبت کو اپنے معاشرے کی سب سے پسندیدہ بات قرار دیا۔ سب سے زیادہ تعداد میں ، یعنی ۹۸ فیصد لبنانی خواتین کا مطالبہ تھا کہ ان کو اپنے ووٹ کے حق کو آزادانہ طور پر استعمال کرنے کا اختیار حاصل ہونا چاہیے۔ ان کے بعد مصر اور مراکش کا نمبر آتا ہے جن کی ۹۵ فیصد خواتین کی رائے بھی لبنانی خواتین کے مشابہ تھی، جبکہ پاکستانی خواتین میں اس طرح کی سوچ کا تناسب سب سے کم یعنی ۲۷ فیصد دیکھا گیا۔

What ……Listening to the Voice of Muslim Women Women want? ''خواتین کیا چاہتی ہیں..... مسلم خواتین کی آواز'' یہ سروے گیلپ آرگنائزیشن کی طرف سے کیے جانے والے ''گیلپ ورلڈ پول'' کا حصہ ہے، جس کے ذریعے سے پوری دنیا کی آبادی کے ۹۵ فیصد افراد کی رائے کو کسی نہ کسی طریقے سے قلمبند کرنے کی منصوبہ بندی کی جارہی ہے۔ محترمہ دالیہ مجاہد، اس ادارے میں مسلم سٹڈیز کے شعبے میں دفاعی تجزیہ نگار ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سروے کے ذریعے نئے اعداد وشمار کی روشنی میں مسلم دنیا کے بارے میں تازہ معلومات فراہم ہوسکیں گی اور مغرب کی طرف سے مسلم خواتین کا جو مظلومانہ اور بے چارگی سے بھرپور تصور پیش کیا جاتا ہے، اس تصویر کا دوسرا رخ بھی منظر عام پر آسکے گا۔ چونکہ مسلم دنیا میں امریکی پالیسی کے تحت ''عورت کی آزادی اور خودمختاری'' یعنی Women Empowerment ہی کو بنیادی ہدف کے طور پر متعین کیا گیا ہے، اس لئے اس پس منظر میں اکٹھی کی جانے والی معلومات کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ محترمہ دالیہ نے مزید یہ بھی کہا کہ ٹھوس شماریات حاصل کیے بغیر کہ درحقیقت ''مسلم خواتین کیا چاہتی ہیں؟'' خواتین کے حقوق کے نعرے کی آڑ میں پس پردہ مذموم مقاصد کو حاصل کرنے کی غرض سے اس موضوع میں جان بوجھ کر ضرورت سے زیادہ دلچسپی پیدا کی جارہی ہے۔ مصری نژاد دالیہ مجاہد جو کہ خود حجاب لیتی ہیں، اس

سوچ کو یکسر رد کرتی ہیں کہ مسلمان خواتین کی ذہن سازی ایک ایسی تہذیب کے زیرِ سایہ کی جاتی ہے جس میں مردوں کا غلبہ ہے۔اپنے دعوے کے ثبوت کے طور پر انہوں نے اس سروے کے اعداد وشمار کا حوالہ دیا جس میں مسلم خواتین نے مختلف موضوعات پر اپنی رائے کا آزادانہ اظہار تک کیا ہے۔محترمہ دالیہ مجاہد کا کہنا تھا کہ ہر معاشرے اور تہذیب میں کوئی نہ کوئی غالب ضابطہ برسر اقتدار موجود ہوتا ہے اور زیادہ تر اس کو وہ طبقات تشکیل دیتے ہیں جو کہ طاقتور ہوتے ہیں،اور عام طور پر یہی دیکھا گیا ہے کہ ایسے مقام پر مردوں ہی کا غلبہ ہوتا ہے تو پھر یہ تمام باتیں مسلم معاشروں سے منسوب کرنا کسی طور پر حق بجانب نہیں ہوسکتا۔

(نیویارک ٹائمز)

☆☆☆

# حمد

مجھے تونے جو بھی ہنر دیا، بہ کمال حسنِ عطا دیا
مرے دل کوحُبِّ رسولؐ دی مرے لب کو ذوق نوادیا

تری جلوہ گاہِ جمال میں، مرا ذوقِ دید نکھر گیا
تری ضوفشانیِ حسن نے مری حیرتوں کو سجا دیا

میں مدارِجاں سے گزرسکا تو تری کشش کے طفیل سے
یہ ترے کرم کا کمال تھا کہ حصارِ ذات کو ڈھادیا

میں ہمیشہ اپنے سوالِ شوق کی کمتری پہ خجل رہا
کہ تری نوازشِ بے کراں نے مری طلب سے سوادیا

جو مجھے دیا ہے مجھے اسی کا حساب دینے کی فکر ہو
مجھے اس سے کوئی غرض ہو کیا اسے کیا دیا اسے کیا دیا

عنایت علی خان

# اپنی لختِ جگر کی یاد میں

میرے گھر کے آنگن میں کونپل کھلی
مجھے ربِ رحمان سے رحمت ملی

شہہِ دو جہان کی نویدِ سحر
ہے جنت کا پروانہ لختِ جگر

سنواری گلستانِ دیں سے حیات
نہیں مجھ کو بھولی تری کوئی بات

مہ وسال گزرے دبے پاؤں سب
اجل منتظر تھی کھلی آنکھ جب

لگا ہونے لمحہ بہ لمحہ عیاں
بہاروں پہ چھانے لگی ہے خزاں

مسافر عدم کو روانہ ہوئے
جو اپنے تھے سارے بیگانہ ہوئے

اُتارو لحد میں یہی ہے مکاں
مددگار کوئی یہاں نہ وہاں

عمل نیک بس کام آئے گا اب
جو ستّر قدم دور جائیں گے سب

میری پیاری لختِ جگر غم نہ کر
سدا نور برسے تری لحد پر

شاہدہ سحر

# گھر کیسے تقسیم ہوا

سکون وامن سے،
مہر ومحبت اور خوشی کے ساتھ
جینے کے لئے ہم گھر بناتے ہیں
اخوت کے ستونوں سے
اسے مضبوط کرتے ہیں
ہم اپنی باہمی الفت سے
اس کو رنگ دیتے ہیں
مگر پھر ہنستے بستے گھر میں
رنجش آ ٹھہرتی ہے
محبت پاش نظروں میں
نئی بیگانگی بیدار ہوتی ہے
ہماری گفتگو کا ذائقہ
میٹھا نہیں رہتا،
ہماری خیر خواہی کا چلن
ویسا نہیں رہتا،
ہمارے دکھ، ہمارے سکھ بھی
مشترکہ نہیں رہتے

ہمارے درمیاں اک اجنبیت
پلنے لگتی ہے
ہمارے درمیاں اک بے رخی
پروان چڑھتی ہے
ہماری بدگمانی بڑھنے لگتی ہے،
ہمیں اک دوسرے کا ساتھ دینا
بوجھ لگتا ہے!!
محبت خواب لگتی ہے!!
تعلق ڈھونگ لگتا ہے!!
پھر ایسے موڑ پر ہم
راستہ تبدیل کرتے ہیں!
ہم اپنے ہاتھ سے اس گھر کو پھر تقسیم کرتے ہیں،
نئی دیوار اٹھتی ہے
اور اپنے اپنے حصے میں،
ہم اپنے نام کی تختی لگاتے ہیں!

(16 دسمبر 1971 کی یاد میں)

شمیم فاطمہ

# دشتِ کربلا سے

زمانے میں شجاعت کی کہانی
ہوئی آغاز دشتِ کربلا سے

فنا کے بعد فتح و کامرانی
ابھرتی ہے وجودِ کربلا سے

محمد مصطفیٰؐ شمعِ ہدایت!
حسین ابنِ علیؓ انؓ کے نواسے

جگر گوشہ ہیں بی بی فاطمہؓ کے
پسر حضرت علیؓ شیرِ خدا کے

کٹا کر سر دیا پیغام ہم کو
کہ حق مٹتا نہیں کرب وبلا سے

علَم بردارِ حق ڈرتے نہیں ہیں
کسی زنداں کسی زنجیرِ پا سے

حسینیؓ قافلے کا کیا تعارف!
ہراک آراستہ صبر و رضا سے

عفیفہ بیبیاں ، بیمار بچے
پھرا کوئی نہیں عہدِ وفا سے

نظر کے سامنے آبِ رواں اور
سکینہ تشنہ لب، اصغر ہیں پیاسے

لہو جلتا رہا جب تک رگوں میں
دیئے لڑتے رہے موجِ ہوا سے

مقامِ بندگی کو اَوج ایسا
ملا کرتا ہے تسلیم و رضا سے

ضرورت ہے کہ ہم اہلِ محبت
سجائیں مانگ انؓ کی خاکِ پا سے

شمیم فاطمہ

حمیرا خالد

# آنگن

یہ نوبت آ جائے گی! ایسا تو اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔

کیسی چاہت سے بیاہ کر لائی تھی۔ بڑے ارمانوں سے بھیا سے رشتہ لیا تھا۔ یوں تو سب ہی بچیاں اپنے والدین کے دل کا ٹکڑا ہوتی ہیں۔ لیکن صاعقہ کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ اوپر تلے چار بھائیوں کے بعد صاعقہ کی آمد نے گویا گھر میں روشنیاں بکھیر دیں۔ والدین کے دل کی آرزو، بھائیوں کی آنکھ کا تارا، زمانے کے گرم وسرد سے نا آشنا بچی نے شعور کی دنیا میں آنکھ کھولی تو ہر سمت بادموافق ہی ملی۔ لہٰذا طبیعت میں نرمی کے ساتھ زود رنجی اور کم گوئی کے ساتھ حساسیت مزاج کا حصہ بن گئی۔ اس کے لئے رشتوں کی کمی نہ تھی لیکن خدیجہ بیگم نے پہلے ہی بھیا پر اپنا حق جتاتے ہوئے صاعقہ کا رشتہ پکا کر لیا۔ ان کی نازک کلی کی قدردانی انکے اکلوتے بیٹے کے سوا اور کون کر سکتا تھا۔

اور بھیا نے بھی اسی بھروسہ پر اپنی جان جگر بہن کے حوالے کی۔ اکلوتا بچہ ہے۔ پھر آپا اور بھائی صاحب کے علاوہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ انکی بیٹی اکلوتی بہو بن کر گھر میں راج کرے گی۔ صاعقہ اس گھر میں فیصل کی دلہن بن کر کیا آئی۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی نومولود کی آمد ہوگئی ہو۔ فیصل حیران تھا کہ وہ جو ماں باپ کی توجہ کا واحد مرکز تھا اب خود اسکی شریک حیات شریک ہوگئی ہے۔ اماں، ابا تو بہو کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔

''گھر گرہستی چلانا تو جوان لوگوں کا کام ہے۔'' اماں نے صاعقہ کو مکمل اختیار کا احساس دلاتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! تم ہی اس گھر کی ملکہ ہو۔ جیسے چاہو اپنی ریاست کا انتظام سنبھالو۔ ہمارا ضعیف وجود تمہاری مدد تو نہ کر سکے گا لیکن یہ ہاتھ ہمیشہ دعاؤں کچھیا پھیلے رہیں گے۔''

صاعقہ نے لمحہ بھر کو پھپھو امی کے وجود پر گہری نظر ڈالی جبکہ وہ میکہ جانے کیلئے تیار کھڑی تھی۔ یہ پیش بندیاں کیوں کی جا رہی ہیں۔ دل بدگمان ہوا۔ انہیں اتنا بھی احساس نہیں کہ میں یہاں کیسے وقت کاٹ رہی ہوں۔ فیصل صبح کے گئے رات کو خبر لیتے ہیں۔ ان کے ماں باپ کو کمپنی دینے کیلئے بس میں رہ گئی ہوں!

اس نے جذبات کو سنبھالتے ہوئے شائستگی سے خدا حافظ کہا اور میکے جانے کے خوشگوار تصور نے ساری کلفت دور کر دی۔

''کب آؤ گی؟'' فیصل نے آہستگی سے پوچھا۔

''پتہ نہیں'' اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

''کیوں یہاں آنے کو دل نہیں چاہتا کیا؟'' اس نے مان سے کہا۔ مگر اس کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ واپسی پہ فیصل راستے بھر سوچتا آیا صاعقہ اس سے خوش نہیں ہے۔ اس کا

رویہ اس کے گھر میں اتنا سرد اور بیزاری والا کیوں ہے؟ جب بھی وہ اس کی توجہ کا طالب ہوتا، صاعقہ ٹال مٹول کر دیا کرتی۔

اسکی جھنجلاہٹ کو دیکھ کر اماں نجانے کیسے جان جاتیں اور صبر کی تلقین کیا کرتیں۔ ''آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ پورے اطمینان سے کہا کرتیں۔

پھر صاعقہ نے صاف کہہ دیا کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی ہے اور یہ سسرال میں ممکن نہیں۔ وہ اپنے میکے میں ہی رہنا پسند کرے گی۔

فیصل کو اپنی بیوی کی طرف سے اس انداز میں بات کرنے کی توقع نہ تھی۔ پھر بھی بات سلجھاتے ہوئے ملائمت سے کہنا چاہا کہ ابھی ہماری شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ کچھ دن تو اس گھر کو دے دو پھر اپنی خوشی پوری کر لینا۔

''تو گویا آپ کے گھر والوں کی خدمت گزاری کرتے رہنا میرا مقدر ٹھہرا؟'' اس نے روایتی بہوؤں کے سے انداز میں اندیشوں کا اظہار کیا۔

فیصل سوچ میں پڑ گیا کہ کیا شوہر سے جڑے ہوئے رشتے عورت کی نظر میں اتنے کڑوے ہوتے ہیں اپنے دوھیالی رشتے کا بھی لحاظ نہیں کرتیں۔ کیا اسے بھی ماموں ممانی کے بارے میں ایسے ہی سوچنا چاہیے جیسے صاعقہ اپنی پھپھو ساس کیلئے ناگواری کا اظہار کر رہی ہے؟

گھر کی فضا کو مکدر ہونے سے بچاتے ہوئے اس نے صاعقہ کی مرضی کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ اب وہ دونوں صبح سویرے تیار ہوتے کہ فیصل کو آفس جانے کیلئے وقت سے پہلے نکلنا ہوتا ہے اور صاعقہ کو کالج تک چھوڑ کر اپنے کام پر جانے کے لئے اسے ہر روز کافی مشقت اٹھانا پڑتی لیکن ہنسی خوشی گاڑی کھینچتا رہا۔

اماں پہلے کی طرح جیسے تیسے گھر کے کام نبٹا رہی ہوتیں اور شام کی منتظر ہوتیں کہ کب بیٹا بہو آئیں تو دستر خوان سجے۔

صاعقہ کی تعلیمی مصروفیات اور دوست احباب نے ایسا گھیرا کہ اب وہ گھر کی ضروریات پر تو کیا دھیان دیتی فیصل کیلئے بھی وقت نکالنا مشکل لگتا۔ کمرے کی سجاوٹ گرد آلود ہو کر اکتاہٹ پیدا کر رہی تھی۔ الماریاں تنگی داماں کی شکایت کر رہی تھیں۔ ماما ہر ہر قدم پر اسے یاد آیا کرتیں جو اس کے بگڑے کام سنوار دیا کرتیں اور اسے پتہ بھی نہ چلتا۔

''آج تو اچھا سا ناشتہ ہو جائے'' فیصل نے بستر پر کروٹ بدلتے ہوئے بڑی چاہت سے فرمائش کی۔ ہفتہ بھر میں ایک دن تو ملتا ہے جس میں وقت کی بندش سے آزاد ہو کر من مانی کر لی جائے۔

''کیوں بھئی کیا خیال ہے؟'' اس نے بیوی کو متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

پلیز..... فیصل مجھے دیر ہو جائیگی۔'' اس نے کپڑے بیگ میں ٹھونستے ہوئے بتایا کہ'' کاشف بھیا لینے آ رہے ہیں کتنے دن سے گھر جانے کو جی چاہ رہا تھا مگر آپکو تو فرصت ہی نہیں۔'' فیصل اس غیر متوقع اطلاع پر بھڑک اٹھا۔

''کس خوشی میں بھئی..... وہ تمہارا گھر ہے تو یہ کس کا گھر ہے اور تمہاری اب وہاں حیثیت ہی کیا ہے'' موڈ بگڑا تو تلخی

بڑھتی چلی گئی۔

صاعقہ نے آنسو ضبط کرتے ہوئے سوچا۔فیصل تم نہیں سمجھو گے یہ احساسات.....تم کیا جانو تم اکیلئے پلنے والے..... تم کو کیا پتہ بہن بھائی کیا ہوتے ہیں۔ماں باپ،ان کا لاڈ پیار، سب کیسے بھلادوں۔ وہ وقت جب صرف میری خوشی چلتی تھی۔میرے ارمان پورے کیے جاتے تھے اور یہاں..... یہاں صرف تمہاری مرضی، تمہارے باپ کا حکم..... اور تمہارے کام.....

اس کا دل باغی ہوا جارہا تھا۔اس سے پہلے کہ اندر کا زہر باہر آجاتا اس نے فوری چلے جانے میں ہی عافیت جانی۔اور اماں کی آواز پر بھی کان نہ دھرا جو شاید کسی کام کیلئے بلا رہی تھیں۔

بادل نخواستہ تکیے میں منہ دے کر فیصل دوبارہ سونے کی کوشش کرتا رہا۔لیکن دل ودماغ غصہ سے کھول رہے تھے۔ اماں کا خیال نہ ہوتا تو لاڈ و پری کو اوقات سمجھا دیتا۔

کتنے ہی دن گزر گئے۔فیصل نے بلایا نہ صاعقہ نے آنے کا ارادہ ظاہر کیا۔البتہ اماں کے سامنے اسے روز ہی جوابد ہی کرنا ہوتی کہ وہ اس کے بغیر اداس ہیں۔لیکن وہ کیا بتاتا کہ انکی بہو یہاں خوش نہیں اپنے گھر میں طالبعلمی کی زندگی کے مزے لینا چاہتی ہے۔

جب اس سے کوئی جواب نہ بن پایا تو اماں بہت کچھ سمجھ گئیں۔

''بیٹا! زندگی تو نام ہی الجھاؤ کا ہے۔ بالکل ایک الجھی ہوئی ڈور کی طرح کھینچا تانی کرو گے تو سر اہاتھ لگے گا نہیں اور ڈور ٹوٹ بھی سکتی ہے۔سمجھداری یہ ہے کہ پیار محبت اور نرمی سے الجھن سلجھائی جائے بہت نازک معاملہ ہوتا ہے۔''انہوں نے پریشانی سے بیٹے کو دیکھا۔

''اللہ نے عورت کو ٹیڑھی پسلی سے پیدا کیا ہے۔سیدھا کرو گے تو ٹوٹ جائے گی۔مرد عقل رکھتا ہے اور عورت جذبات، وہ اتنے رشتے اور جذبات کُچل کر آتی ہے اب اسے ایسا ہی رہنے دو۔''ماں نے سمجھایا۔

اماں کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ ہمیشہ اپنی بہو کی طرف داری کرتی ہیں۔بھتیجی جو ہے۔اس نے شکوہ کیا تو جواب میں ماں کی مامتا بھری مسکراہٹ نے فیصل کو شرمسار کر دیا۔اسے احساس تھا کہ صاعقہ کے گھر میں نہ ہونے سے ماں کتنی تنہا تھی۔اپنے ناروا رویہ پر تاسف بھی تھا۔وہ سوچ رہا تھا کہ ماں کا کہنا درست تھا کہ صرف اپنے زاویہ سے چیزوں کو دیکھنا نا انصافی ہے۔حقوق چھینے نہیں جاتے بلکہ فرائض ادا کر کے لئے جاتے ہیں۔

اب تو اسے بھی تنہائی کاٹنے لگتی تھی۔وہ دل ہی دل میں سوچا کرتا کہ کتنا اچھا ہو کہ سب کچھ بھلا کر صاعقہ خود ہی چلی آئے۔ وہ بھی پچھلی تلخیوں کو ہرگز یاد نہ دلائے گا۔اماں کی باتوں سے اسے بھی ہمدردی ہونے لگی تھی۔اماں کی نصیحت اسے یاد آرہی تھی۔انسانی جذبات واحساس بہت نازک ہوتے ہیں۔جس طرح کسی پودے کو ایک زمین سے دوسری زمین میں لگانے کے لئے انتہائی نگہداشت کی ضرورت ہوتی

ہے۔ایسے ہی پرائے گھر سے آنے والی کو اپنا گھر بسانے کے لئے بے حد محبت اور صبر چاہیے۔تب رفتہ رفتہ پودے کی طرح جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔کئی دن سے صاعقہ کی طبیعت اچھی نہیں تھی۔دل اچاٹ اچاٹ سا ہو رہا تھا۔ماما تو کتنی ہی بار سمجھا سمجھا کر خاموش ہو چکی تھیں کہ بیٹا فیصل کو بلا لو یا نہیں تو فون ہی کر لو۔مگر کاشی بھیا جو صاعقہ کے جذبات کو سمجھ رہے تھے فوراً بول اٹھتے۔ ہرگز نہیں.....کوئی ضرورت نہیں فیصل کو اگر پروا نہیں تو ہماری بہن بھی اپنے گھر میں بھاری نہیں۔ بھیا کی شہ سے اس کی انا کو ہوا ملتی اور وہ دل میں طے کر لیتی کہ فیصل کے آگے اپنے آپ کو ہرگز کمزور نہ ہونے دے گی۔اس کے باجود اسے اندر سے اپنا آپ ٹوٹتا اور بکھرتا محسوس ہو رہا تھا۔

ماما کی آواز کی گونج کسی حقیقت کو تسلیم کرنے کو کہہ رہی تھی۔

''بیٹا نکاح کے بول ایک طلسماتی اثر رکھتے ہیں دو بالکل اجنبی فرد بھی جب اللہ کو شامل کر کے قول و قرار کرتے ہیں تو اللہ دلوں کو جوڑ دیا کرتا ہے۔اللہ کے جوڑے ہوئے رشتہ کو توڑنے سے زمین آسمان لرز اٹھتے ہیں۔اب سکینت ہے تو مل جل کے ساتھ رہنے میں ورنہ بے اطمینانی اور پریشانی کے سوا کچھ نہیں۔''

''میری بے چینی کی وجہ یہی تو نہیں؟'' اس نے اپنی حالت پہ غور کیا مگر میں ہی پہل کیوں کروں؟ اسے پھپھی اماں کا خیال آیا۔پتہ نہیں پھپھی اماں کیسی ہیں؟ اپنی بے حسی کا احساس ہو رہا تھا۔کتنی بے چینی سے وہ اس کے آنے کا انتظار کیا کرتی تھیں۔اس کے بغیر لقمہ توڑنا بھی ان کو گوارا نہ تھا۔اب اسے ندامت ہو رہی تھی کہ فیصل کی ناراضگی میں اس نے پھپھو امّی کو بھی بھلا دیا تھا۔کسی نے سچ کہا ہے کہ پھپھی بھتیجی ایک ذات ماں بیٹی دو ذات.....وہ حیران ہی تو رہ گئی جب ماما نے بتایا کہ پھپھو اماں اسے لینے کو آ رہی ہیں۔اسے یوں لگا سخت پیاس میں ٹھنڈا میٹھا مشروب مل گیا ہو۔

پھپھو اماں کے ہمراہ اپنے آنگن میں قدم رکھتے ہی جیسے پھر سے بہار آ گئی ہو۔فیصل کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ تو پھپھو امی کی محبت کی آغوش میں چھپ جانا چاہتی تھی اس نے سوچا ہمیشہ کی طرح پھر ایک ماں نے بگڑتے گھر کو سنبھالا۔ اگر پھپھو امی نہ ہوتیں تو.....وہ کانپ کر رہ گئی۔

اچانک فیصل کمرے میں آئے تو اسے دیکھ کر ٹھٹھک گئے۔ایک خوشگوا ہوا کا جھونکا دلوں کو چھوتا ہوا گزر گیا۔اماں کے بالوں کو محبت سے سنوارتی صاعقہ کا یہ روپ اس کے دل میں اتر گیا۔اماں نے مصنوعی خفگی سے بیٹے کی لاپروائی پر حکم سنایا کہ اب صاعقہ تمہارے ساتھ نہیں بلکہ میرے پاس رہے گی۔اور فیصل نے بھی ماں کی سزا پر سعادت مندی سے سر تسلیم خم کرتے ہوئے لاڈ سے ماں کی گود میں سر رکھ دیا۔''مجھے بھی تو آپ کے ساتھ رہنا ہے۔اپنے بیٹے کو دور تو نہیں کریں گی ناں۔''زمین و آسمان ان کے مقدس جذبوں پر جھوم اٹھے۔

☆☆☆

ناولٹ
پہلی قسط

نصرت یوسف

# کہیں چاند راہوں میں کھو گیا

وہ جو تسبیح کے دانوں پر محرومیوں کا شکوہ پڑھتا تھا، جب اس کی فریاد سنی گئی تو وہ کپکپا اٹھا.....تشکیک کی سرحدوں پر گھومتے ایک انجان کی کہانی

وہ ایک ماہر فوٹو گرافر تھا۔ جمال اور کمال کے کتنے ہی نمونوں کا عکس اس نے قید کیا تھا۔ جیواور جینے دو کے فلسفہ کا حامی۔ اپنے حلقہ یاراں میں وہ ''وائے'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہ انگریزی کا why تھا یعنی ''کیوں''۔ یہ نام ہونے کی وجہ محض ایک مرتبہ کے اٹھائے وہ سوالات تھے جو اس نے دوستوں یاروں کی محفل میں کیے تھے۔ سوالات کرنا لاحاصل ہی رہا۔ الٹا وہ عمر خیام سے ''وائے'' بن گیا۔ اسے اس نام پر کوئی اعتراض نہ تھا، زندہ دل اور ہنسنے ہنسانے والا شخص تھا۔ اس نئے لقب پر خوب محظوظ ہوا لیکن فرصت کے لمحات میں در آنے والے خیالات جن کی وجہ سے وہ ''وائے'' بنا تھا وہ جوں کے توں رہے۔ اس نے پوچھا تھا۔

دکھ دنیا میں کیوں ہے؟

فنا ہی ہونا ہے تو جنم کیوں ہے؟

امن میں خوبصورتی ہے تو جنگ کیوں ہے؟

محبت سے دنیا رواں رہتی ہے تو ظلم کے معنی؟

اس محفل میں عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر ہو رہا تھا ہر ایک اپنا اسٹیٹس برقرار رکھنے اور بڑھانے کیلئے ان عالمگیر مدوجزر پر اظہار خیال کر رہا تھا جو دنیا کو بری طرح ہلا رہے تھے۔ عمر خیام بھی اپنے پروفیشن پر اس کے اثرات سناتے ہوئے ان میں شامل تھا۔ موبائل وائبریٹ ہوا اور اس نے بٹن دبا کر میسج کھول لیا۔ سرسری سی نگاہ سے اس نے پرکھا دنیا کے تین چار المناک واقعات کا ذکر کرتے ہوئے آخری میں لکھا تھا کہ یہ سب امریکہ کے ''گریٹ گیم'' کا حصہ ہے۔ نمبر اس کے لئے جانا پہچانا نہ تھا۔ ایسا کچھ نیا بھی نہ تھا کتنے میسج اسے آتے جن کا نمبر اس کیلئے اجنبی ہی ہوتا۔ اب یہ میسج بھی پڑھ کر اسے ڈیلیٹ کر دیا۔ لیکن لاشعوری طور پر وہ اچانک یہ سوالات لے آیا جو کچھ عرصہ قبل اس کے پاس پھٹکے بھی نہ تھے۔ سب نے حیرت سے عمر خیام کے یہ سوالات سنے۔

''کیا انکو حل کرنے پر کوئی انعام ملتا ہے؟'' ایک نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا

''انعام نہیں سکون ملتا ہے'' اس نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

''ارے چھوڑ یار اس وائے کو، بتاؤ کون سی ویب سائٹ ہے جہاں سے کینیا کی شہریت کیلئے معلومات مل سکتی ہیں؟'' دوسرے نے عمر خیام کی بے موقع دخل اندازی پر مزاحمت کی تو سب ہی دوبارہ پرانے موضوع پر آ گئے۔ یوں عمر خیام اس محفل کے برخاست ہونے تک ''وائے'' ہو گیا۔

دنیا کے ہر انسان کی طرح زندگی اس کے لئے بھی محض پھولوں بھری نہ تھی۔ انکو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دیتا۔

بڑی خواہشوں کے بعد پیدا ہونے والی اکلوتی بیٹی کا ابنارمل ہونا اس کی ہنسی کو مدھم کر چکا تھا۔ وہ ہنستا اب بھی تھا مگر دھیما۔ زندگی سے لطف کا عرق اب بھی کشید کرتا تھا لیکن کم۔

زندگی میں ''کیوں'' اس کے ذہن میں اس طرح کبھی نہ ابھرا تھا جیسا اب ابھرنے لگا تھا۔ وہ رات سونے سے قبل اپنی کھڑکی سے نظر آنے والے آسمان پر نگاہ ٹکانے لگا تھا۔ نہ جانے وہاں کیا تھا لیکن بے اختیار وہ اوپر دیکھتا جہاں کبھی بہت اور کبھی اکا دکا ستارے چمک رہے ہوتے۔

اس رات بھی ساتویں منزل پر واقع اسکے خوبصورت پینٹ ہاؤس میں کھڑکی سے آتے تازہ ہوا کے جھونکے بیڈروم میں پڑے نیٹ کے خوبصورت پردوں کو خوب ہلا رہے تھے وہ بستر پر تھا۔ نیند اسکی آنکھوں سے دور تھی۔ بیوی بچوں کے ساتھ دوسرے شہر اپنے میکہ گئی ہوئی تھی سو گھر میں خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ اسکے گھر میں اس کا اور اسکی بیوی تہمینہ کا جمالیاتی ذوق خوب واضح تھا۔ جن میں قدرتی نظاروں کی تصویریں بڑی ہی دلفریب تھیں۔ اسکے گھر آنے والے کے لئے یہ پینٹ ہاؤس بڑا ہی فرحت انگیز تھا۔ خود اسے بھی اپنی زندگی بڑی ہی ہنستی مسکراتی لگتی۔ لیکن محض چار برس قبل تک فوٹو گرافی کے میدان میں اعلیٰ مقام تک پہنچنے کے لئے اس نے بڑی دلجمعی سے محنت کی تھی۔ تہمینہ کے خوشگوار ساتھ نے جیسے اس کی زندگی میں مسکراہٹیں بھر دی تھیں۔ تہمینہ اسکی ماں کی پسند تھی اور وہ ماں سے اس معاملے پر اکثر ہی مشکور ہو جاتا۔ حالانکہ اسکے ماں باپ کو اس کا پروفیشن پسند نہ تھا۔ عمر خیام کے حساب سے وہ پرانی سوچ رکھتے تھے، جہاں تصویر بنانے والا جہنمی تھا۔ لیکن تہمینہ انکی پسند ہونے کے باوجود عمر خیام کی بھی پسند بن چکی تھی۔ اس نے اپنی زبان سے کبھی میاں سے اس کے پروفیشن پر اختلاف نہ کیا تھا۔ عمر خیام کی اہم ترین خوبی اس کا دوسروں پر اپنی مرضی مسلط نہ کرنا تھا۔ سو بیوی کے لئے بھی وہ بڑے ظرف کا مالک تھا۔ اس کی محبتوں اور خیال کا قدر دان۔

تہمینہ کو بھی دو بیٹوں کے بعد بیٹی کی بڑی خواہش تھی بڑی چاہتوں اور مرادوں کے بعد وہ یکم رمضان تھا جب روئی کے گالوں کی طرح سفید اور ملائم سے گالوں والی بچی عمر خیام کی بانہوں میں آئی۔ اس کے دل میں جیسے کسی نے ٹھنڈک اتار دی تھی۔ پیدائش کے فوراً بعد پتہ چلا کہ چینی سی گڑیا اولین غذا کے حصول کیلئے چوسنے کے عطا کردہ الہامی علم سے محروم ہے، بہترین ہسپتال، بہترین ڈاکٹروں کی موجودگی بھی اس معاملے میں بیکار تھی، کوئی دنیا کی طاقت اس کو یہ عمل نہ سکھا سکتی تھی، ہاں اس کو دوسرے ذریعے سے غذا دی جا سکتی تھی۔ سو ماں نے غم کو خوشی پر حاوی نہ ہونے دیا اور بچی کو چمچ سے غذا دی جانے لگی۔

یہاں تک بھی ہوتا تو غنیمت تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسکی محرومیاں واضح ہوتی چلی گئیں۔ انہوں نے اس کا نام ''انعمت'' رکھا تھا جو وقت کے ساتھ صرف ''انی'' رہ گیا۔ عمر خیام اور تہمینہ کو حیرت تھی کہ پیدائش سے قبل انی کے جو ڈھیروں ٹیسٹ ذہنی اور جسمانی صحت کے حوالے سے لئے گئے تھے، وہ محض دل کا بہلاوہ تھے یا انعمت انکی بچی نہیں ہے۔ ان تمام ٹیسٹ میں کبھی کسی ابنارمیلیٹی کا ہلکا سا شائبہ تک نہ آیا تھا۔ پھر کیسے اتنی پیچیدہ کیس کے ساتھ انکی اولاد ہے۔ انی کسی بھی طرح کسی اور کی نہ تھی۔ یہ تو محض دکھ سے گھبرا کر فرار بھرا خیال تھا جو وہ ایسا سوچتے تھے۔ بچی ہو بہو اپنی ماں کے سے نقش کی تھی۔ وہ اگر صحتمند ہوتی تو ایسی ہی خوبصورت لگتی جیسی تہمینہ میں دلربائی تھی۔ لیکن ذہنی عدم توازن سے اس کا چہرہ اب ایسا دھندلایا لگتا جیسا شفاف شیشہ بھاپ یا اوس سے مدھم پڑ جاتا ہے۔ وہ سوچتا جب رب اپنے آپ کو رحمان اور رحیم کہتا ہے تو اس نے

ایسے دلخراش تجربہ سے کیوں اس کو گزارا ہے؟

اس رات بھی جب رمضان کے چاند کی اطلاع آ چکی تھی۔ اور وہ زندگی کے بکھیڑوں اور جھمیلوں کو نمٹا کر آرام کے لئے بستر پر آیا تو موبائل بج اٹھا۔ تہمینہ کا فون تھا۔ اس نے حیرت سے اسکرین کو دیکھتے ہوئے فون ریسیو کرلیا۔ فون سننے کے بعد اس کا دل بوجھل ہو چکا تھا۔ انی گھر کے اندر بنی سیڑھیوں سے لڑھک گئی تھی۔ حالانکہ وہ محض دو سیڑھیاں تھیں لیکن اس کا جسم توازن برقرار نہ رکھ پایا تھا۔ گرنے سے اس کو کافی چوٹیں آئی تھیں۔ تہمینہ نے اس لئے اپنے میکہ رکنے کا پروگرام مختصر کر کے آئندہ ہفتہ واپسی کا ارادہ کرلیا تھا۔ ورنہ وہ مہینہ بھر کا پروگرام بنا کر گئی تھی جو تقریباً نصف رمضان میں ختم ہونا تھا۔ عمر خیام نے ریموٹ اٹھا کر pause کیے ہوئے سی ڈی پلیئر کو بند کر دیا جہاں اس نے رمضان کے احترام میں قرأت لگا رکھی تھی۔ اس کا دل اپنے خالق اور مالک سے ناراض ہو چکا تھا۔ صرف میرے لئے ہی کیوں اتنی بڑی آزمائش؟ وہ سوچ رہا تھا اور تصور میں اپنے تمام خوش باش دوستوں کو لا رہا تھا جن کے پاس زندگی میں دل دکھانے والا کوئی عنصر نہ تھا اور اگر تھا تو اس کے خیال میں اتنا تکلیف دہ نہ تھا جتنا اس کا تھا۔ اس کی پوری زندگی انعمت کے آنے کے بعد تبدیل ہو کر رہ گئی تھی۔ چار سال سے اسکی بیوی بچی کے ساتھ مصروف ہوئی تھی اور پوری فیملی کے اکٹھے مل کر بیٹھنے بولنے کے مواقع اتنے کم ملے تھے کہ وہ انگلیوں پر گن سکتا تھا۔ چار سال کا مطلب تھا ایک ہزار چار سو دن، لیپ ائیر کے ایک دن کا افاقہ ایک ہزار ایک سو اکسٹھ دن بناتا تھا۔ وہ سب مل کر اتنے ڈھیر دنوں میں بیس مرتبہ بھی نہ ہنسے بولے تھے۔ تہمینہ تو جیسے ہنسنا بھول گئی تھی۔ ہاں عمر خیام نے نیند میں کئی بار اسکی آنکھ سے ٹپکا آنسو گال پر ڈھلکا دیکھا تھا۔ وہ ماں سوتے ہوئے بھی اولاد کے لئے غمزدہ تھی۔ اس آنسو کو نرمی سے اپنی ہاتھ سے صاف کرتا اور سوچتا، رب تو اپنے آپ کو ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرنے والا کہتا ہے ۔ یہ کیسی محبت ہے کہ ہمارے آنسو ہیں اور اسکی خاموشی۔ ایک لمبا سانس لے کر وہ اٹھ بیٹھا۔ پھر اسکی رات سوتے جاگتے ہی گزر جاتی۔

رحمتوں کے نزول کا مہینہ شروع ہو چکا تھا اور وہ بگٹٹ بھاگ کر برستی رحمت سے اپنے آپ کو محروم کر رہا تھا۔ روزے جو وہ پابندی سے رکھتا تھا۔ بڑی آسانی اور خاموشی سے چھوڑنے شروع کر دیے۔ روزے چھٹے تو نمازیں بھی چلی گئیں۔ ویسے بھی سارا سال نمازوں کا وہ باقاعدہ عادی نہ تھا لیکن رمضان میں باقاعدگی سے روزے اور نمازیں اس کے معمول کا حصہ تھیں۔ لیکن یہ رمضان کیسا رمضان تھا کہ نہ روزے تھے اور نہ نمازیں۔ دل کی بے کلی اور بے چینی لافٹر تھراپی سے دور کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی جو لاحاصل ہی تھی۔

پانچ روزے گزر چکے تھے۔ گویا پانچ مرتبہ ڈھیروں ڈھیر رحمتیں موسلا دھار دن رات ہر لمحہ برسیں اور وہ ان سے بے نیازی دکھا گیا۔ روٹھا روٹھا اور خفا خفا، خالق ہر رات بڑی محبت سے پکارتا ''ہے کوئی جو مجھ سے مانگے میں اس کو دوں'' کتنے جو سال کے گیارہ مہینے اس پکار پر نہ آتے تھے وہ اس چھاجوں چھاج رحمتوں بھری ساعتوں سے فیض یاب ہو رہے تھے۔ ماتھے ٹیک کر اس سپر پاور سے مانگ رہے تھے جو کہتا ہے کہ کن تو فیکون ہو جاتا ہے مگر عمر خیام نے تو اپنے آپ کو خود ان تمام خوش بخت

لمحات سے محروم کر دیا تھا۔ افطار سے قبل جب بندے اور رب کے درمیان کوئی رکاوٹ باقی نہیں ہوتی وہ اپنی محرومیوں اور دکھوں کی کتھا اس مقتدر اعلیٰ کو کیا پیش کرتا جبکہ وہ روزے کی سعادت سے ہی محروم تھا!

اگلے ہفتے تہمینہ گھر آ چکی تھی۔ عمر کی تبدیلی نے اس کے دکھ میں اضافہ کر دیا تھا۔ عمر خیام جیسے شخص سے بیوی کو بات منوانے کیلئے بڑی حکمت اور نرمی سے کام لینا ہوتا ہے۔ وہ یہ بات بہت پہلے ہی سمجھ چکی تھی۔ اس حکمت اور نرمی کے لئے بھی اس کو ذہنی اور جذباتی توانائی درکار تھی۔ جو انی کے ساتھ لگ کر پوری کی پوری خرچ ہو جاتی تھی۔ اب میاں کے یہ بدلے بدلے اطوار وہ کیسے درست کرے، یہ اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ سو عمر خیام اپنی روش پر رہا اور رمضان گزرتا رہا۔

پندرہ روزے ہو گئے تھے۔ فوٹو گرافی کا کام جو رمضان کے پہلے ہفتہ ذرا دھیما پڑا تھا۔ افطار پارٹیوں کی بدولت دوبارہ بڑھ چکا تھا۔ اس شام جب وہ اس پرشکوہ کوٹھی میں داخل ہوا تو افطار پارٹی میں کچھ دیر تھی۔ اس کی ٹیم کے دولڑکے گھنٹہ بھر قبل ہی یہاں آ چکے تھے۔ خود عمر خیام محض آدھ پون گھنٹہ کیلئے ہی کہیں جاتا تھا۔ وہ اپنے کیریر کی اس سطح پر آ چکا تھا جہاں اسکے کام اور وقت کی قیمت بہت بڑھ چکی تھی۔ یہاں اس نے محض پندرہ منٹ گزارنے تھے۔ کوئی مذہبی سوچ رکھنے والا اس محفل کو دیکھتا تو وہ اس کو افطار پارٹی کے علاوہ ہر نام دے سکتا تھا۔ فن فیئر کہہ سکتا تھا، میٹ اینڈ ٹریٹ کہہ دیتا، سمر گالا یا پھر سپر فیسٹ، رمضان اور اس کا تقدس بہر حال دور دور تک ایسی پارٹیوں میں نہ ہوتا تھا جہاں عمر خیام افطار پارٹی شوٹ کرنے جاتا تھا۔ سو اس کے لئے یہ پارٹی بھی بالکل ویسی ہی ہوتی اگر خوبصورت وسیع لان میں بنے چبوترے پر کرسی پر بیٹھا وہ اسمارٹ سا لڑکا مائیک تھامے ملا کی سی باتیں نہ کر رہا ہوتا۔ عمر خیام نے دلچسپی سے اپنے کیمرے کے لینز کو اس پر فوکس کیا، جسکی فراخ پیشانی پر چمک واضح تھی۔ وہ اردو اور انگریزی زبان کے ملے جلے جملوں کے ساتھ رمضان کے حوالے سے لوگوں سے مخاطب تھا۔ جو سننا چاہ رہے تھے اور جو اپنے آپ کو تمیز دار دکھانا چاہ رہے تھے وہ خاموش بیٹھے اس پر نظریں جمائے تھے، باقی اپنے اپنے مشاغل میں مصروف تھے۔

محفل میں گھومتے ہوئے عمر خیام کو فوراً ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ وعظ اور واعظ اس پارٹی کا حصہ نہیں تھے۔ کتنے لوگ یہ جانتے بھی نہ تھے کہ یہ نو وارد مولوی ہے کون لیکن وہ اس کے لہجے کی خوبصورتی کا اعتراف کر رہے تھے۔ عمر خیام کو نہ واعظ سے دلچسپی تھی اور نہ وعظ سے لیکن بہر حال وہ محفل میں تھا یہاں اسکی آواز اسکے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

''اس مہینہ رب سے لینا ہے اور خوب لینا ہے، خوشیاں، مسرتیں، بلندیاں، محبتیں، مقبولیت، شہرت، غرض ہر وہ چیز جو دنیا کی کوئی طاقت ہم کو دینے پر تیار نہیں۔ اس ماہ اس برستے ابر کرم کی بدولت رب سے لینی ہے۔'' اس نوجوان نے شرکاء کے حساب سے الفاظ کا چناؤ کیا تھا۔ مقصد اللہ اور بندے کے درمیان تعلق کی استواری تھا محض وعظ نہیں۔ لوگوں کی نظروں میں اس جوان کے لئے اب اتنی بیگانگی نہیں رہی تھی۔ کوئی نیک بننا چاہتا ہو یا نہیں خوشی ہر ایک کی فطری طلب ہے۔ مقبول ہر ایک ہونا چاہتا ہے۔ ترقی سب کا ہی خواب ہے، وہ روشن پیشانی والا جوان یہ جانتا تھا اور اسی حساب سے باتیں کرتا لوگوں کو خدا سے نزدیک لانا چاہ رہا تھا۔

''بس شرط یہ ہے صرف اس کو اپنا آقا مان لو، سارے دکھ ایسے کٹ جاتے ہیں جیسے پارہ سونے کو چھو جائے تو سونا یکلخت عام سے دھات میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ لیکن شرط وہی.....''

جوان کی خوبصورت آواز رک گئی، اس نے لمحہ بھر کے وقفے سے لوگوں کو نرم سی نگاہوں سے دیکھا جو زندگی کی میسر کردہ لاتعداد سہولیات کے باوجود روحانی طور پر مضطرب تھے اور اس اضطراب کو دور کرنے کے لئے اپنے خالق سے رابطہ جوڑنے کے بجائے ادھر ادھر عبث سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ انہوں نے جوان کے خاموش ہونے پر پہلو بدلے اور اس کے بولنے کے منتظر ہوگئے۔

''شرط بس وہی کہ اللہ ہی تمہارا ملجا وماویٰ بن جائے۔ صرف اللہ اور صرف اللہ!!'' اسکی آواز میں جیسے دل کی ساری شدتیں سمٹ آئی تھیں۔

شوٹ کرتے ہوئے عمر خیام نے چند آشنا چہروں سے ہائے ہیلو کی جو اپنی خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

''یار دس منٹ ہوگئے اس لیکچر کو جانے کب ختم ہوگا۔'' ایک کھنک دار سی آواز میں خوب بیزاریت تھی۔ ''کول گائے'' (Cool Guy) تھا پچھلے سال تک، لوگ امریکہ جا کر اور اسمارٹ ہوتے ہیں یہ الٹا مذہبی بن گیا۔''

''انصار انکل کے دوست کا بیٹا ہے، اس لئے ورنہ انکے گھر افطار پارٹی میں ایسی بوریت پھیلانے والی کوئی بات نہیں ہوتی۔''

نوجوان لڑکے لڑکیوں کا یہ گروپ اس پر تبصرے کر رہا تھا جو ان کو انکی تکلیفوں انکی تمناؤں اور آرزوؤں سے جڑی خواہشات کو پورا کرنے کا راستہ دکھا رہا تھا۔ ایسا راستہ جس کے ذریعے کامیابی یقینی تھی مگر وہ بات سننے کے موڈ میں ہی نہ تھے۔

اسی لمحے مغرب کی اذان بلند ہوگئی۔ عمر خیام نے گردن گھما کر دیکھا، وہ جوان چہرے پر ہاتھ پھیر رہا تھا، شاید اس نے دو تین منٹ کی دعا بھی کرادی تھی۔ افطار سے قبل کے بہترین اور قیمتی ترین لمحات سے بھی فیض اٹھالیا تھا۔ منٹوں میں وہاں کلو واشر بو (کھاؤ اور پیو) پر پوری دلجمعی سے عمل ہونے لگا۔ جو قابوں میں میسر لوازمات نہ کھا رہے تھے وہ غیبت کر کے مردار بھائی کے گوشت کو استعمال کر رہے تھے، جو موجود مشروبات نہ پی رہے تھے وہ نگاہوں سے چھلکتے میخانوں اور جام کے اردگرد تھے، غرض وہ فرشتے جنہوں نے لمحوں قبل محفل کو اپنے نورانی وجودوں سے ڈھانپ دیا تھا اور اللہ نے سکینت اس لئے اتاری تھی کہ ابوذر جیسے جوان نے اس محفل میں اللہ کا ذکر بلند کر دیا تھا وہ وہاں سے بہت دور جا چکے تھے۔ اور لوگوں نے اپنے دلوں میں بے قراری کا سایہ اترتا محسوس کیا تو ایک دوسرے کے ساتھ مزید بلند آہنگ قہقہے اور لایعنی باتیں کرنے لگے۔

عمر خیام نے بھی اپنا سامان سمیٹا اور باہر آ گیا۔ کوٹھی کے گیٹ کو عبور کرنے سے پہلے وہ لان کے ایک کونے میں ابوذر کو پینٹ کے پائنچے اونچے کیے نماز پڑھتا دیکھ چکا تھا۔ شاید اس نے ایک کھجور اور پانی پی کر نماز کی نیت باندھ لی تھی۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ ٹھٹکا۔ کی چین کا حصہ اسکی جیب سے باہر لٹک رہا تھا جس میں اس کا نام لکھا واضح نظر آ رہا تھا۔ عمر خیام نے زیر لب اس کا نام دہرایا اور دل میں آئے خیال پر غور کرتا اپنی گاڑی تک آ گیا۔ اپنے کلائنٹ کے ہاں کسی بھی قسم

کا کھانا پینا اس کے اصول میں نہ تھا جس پر وہ پابندی سے عمل کرتا تھا۔

''جن کو کوئی دکھ نہ ہو، زندگی بڑے آرام سے چل رہی ہو وہ ہی ابوذر جیسی باتیں کرتے ہیں۔''

یہ تھا وہ خیال جو تازہ تازہ ابوذر کی باتیں سن کر پیدا ہوا تھا۔ اپنے خیال کی درستی پر اسے مکمل یقین تھا۔

''میری طرح کسی کی اولاد کے ساتھ معاملہ ہو اور پھر بھی وہ رب رب کرے تو بات ہے۔'' ایک اور غلط سوچ نے ذہن کو منتشر کر دیا۔ بھلا اس کے وہ دوست جن کے بارے میں سوچ کر وہ انکو خوش نصیب کے لیبل دیتا تھا وہ کب ابوذر جیسے تھے۔ رب سے تعلق کی استواری تو نصیب کی بات ہوتی ہے۔ دنیا کے خوشی اور غم پر اس کا انحصار نہیں ہوتا۔ کتنے خوشیاں پا کر منعم کو بھلا دیتے ہیں، کتنے دکھ کے آتے ہی مولا سے شکایتوں کے انبار لگا دیتے ہیں، تعلق، رشتہ تو کسی کسی کا جڑتا ہے، اور جس کا جڑ جاتا ہے وہ ایک سرشاری کی کیفیت میں آجاتا ہے۔ ہر خوشی، ہر غم اس سرشاری تلے ہوتا ہے، اہمیت بس خالق کی محبت کی رہ جاتی ہے، باقی سب کچھ ثانوی اور ثانوی جو چیز ہو جائے انسان نہ اس پر فخر سے پھولتا ہے اور نہ چیخ کر بکھرتا ہے۔

عمر خیام کو بھی اولاد کا دکھ چٹخا رہا تھا اور وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کیلئے غلط سمت اختیار کر چکا تھا۔ وہ بہر حال ماں کے درجے کو نہ پہنچ سکتا تھا جو محبت کا استعارہ ہوتی ہے۔ تہمینہ جو کہ دن رات انعمت کے ساتھ کھپ رہی تھی، وہ رب کے قریب ہو چکی تھی۔ غم نے اسے کن سے فیکون تک کے یقین کو ایمان میں بدل ڈالا تھا۔ اس کا دل ہمیشہ دعا کرتے ہوئے کسی معجزے کا منتظر ہو جاتا۔ اس ماں کا کردار اتنا بڑھ چکا تھا کہ بیوی کہیں بہت دور چلی گئی تھی۔ وہ بھی کیا کرتی۔ انعمت کی خبر گیری لمحہ لمحہ کرنی پڑتی تھی۔ وہ زیادہ چل نہ سکتی تھی، گر پڑتی تھی۔ کھانا خود سے نہ کھا سکتی تھی، کسی بھی نامعلوم چیز سے کسی بھی وقت اسے الرجی ہو جاتی اور اس کے جسم پر دانے ابھر آتے ان میں خارش ہوتی تو وہ خوب روتی۔ وہ روتی تو تہمینہ بھی رو پڑتی۔ عمر خیام کے لئے زندگی جتنی بھی غمگین ہوتی بہر حال تہمینہ جیسی کٹھن نہ تھی۔ جس کا وہ سوچتا تو بے بسی اور بڑھ جاتی اور ساتھ ہی وہ غلط سمت میں مزید آگے بڑھ جاتا۔

رمضان بھی نیکی کے طلبگاروں کو سیراب کرتا گزر گیا عمر خیام نے عطا و بخشش کے امنڈتے خزانوں سے منہ ہی موڑے رکھا۔

عید کے ہفتہ بھر بعد انعمت خلاف معمول سو رہی تھی۔ تہمینہ بیڈ کے کراؤن سے سر ٹکائے نہ جانے کن سوچوں میں گم تھی۔ اس کا خوبصورت چہرہ چار سال میں کملا گیا تھا۔ چمکتی شوخ آنکھیں ماند پڑ گئی تھیں۔ خوبصورت دراز بال جن کا اسٹائلش سا جوڑا عموماً اس کی دراز گردن پر لگا عمر خیام کو بڑا پسند تھا۔ گئے زمانے کی بات ہو چکی تھی۔ وہ اس وقت پورسلین سے بنی ایسی مورت لگ رہی تھی جس میں زندگی ہی نہ ہو۔

عمر خیام کمرے میں داخل ہو کر بے اختیار ٹھٹک گیا۔ اسے گردن موڑ کر کچھ فاصلہ پر موجود بیڈ پر سوئی انی کو دیکھا جو سوتے میں بالکل وہی دل موہ لینے والی مورت لگ رہی تھی جیسی پیدائش کے فوراً بعد عمر خیام نے اسے دیکھا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ چلتا ہوا بیٹی کے بستر کے قریب آیا اور اسکے سنہری مائل لچھے دار بالوں میں محبت سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہ کسمسانے لگی تو خوف کی ایک جھرجھری سی عمر خیام نے محسوس

کی اور بے اختیار بیوی کو دیکھا۔ اگر یہ اٹھ گئی تو ماں کو پھر اپنے ساتھ مصروف کرلے گی۔ جبکہ اس کے دل میں بے اختیار خواہش پیدا ہوگئی تھی کہ وہ تہمینہ کو اٹھائے اور وہ دونوں اپنے بچوں کے ساتھ پینٹ ہاؤس کے وسیع کھلے حصے میں بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے ہوئے کچھ کھائیں پئیں۔ شام کے چھ بج رہے تھے۔ آسمان پر سیاہ بادلوں کی ٹکڑیاں اور بارش سے قبل کی چلنے والی ہوائیں مٹی کی خوشبو کا ایک آدھ جھونکا لاکر مصروف سے مصروف انسان کو اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ عمر خیام بھی اس وقت کسی کام سے گھر آیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کی کسی کے ساتھ ملاقات طے تھی۔ لیکن تہمینہ کے انی کے بغیر ہونے نے اسکی ساری ترتیب لمحوں میں بدل ڈالی۔ اس نے کمرے سے باہر جا کر ملاقات کا وقت اگلے دن تک کے لئے مؤخر کرتے ہوئے یہ لمحات اپنی بیوی کے ساتھ کیلئے مخصوص کر ڈالے، گو اسے پورا احساس تھا کہ عین وقت پر ایسا کرنا اسکی ساکھ کے شایان شان نہیں اور اگلا فریق اپنی ناگواری بھرپور ظاہر کرچکا ہے۔ لیکن وہ یہ موقع کھونا نہیں چاہتا تھا جب وہ ہو، تہمی ہو اور دونوں بیٹے۔ بس انی اس تصویر میں نہ ہو۔ وہ وقت کی خیرات کی طرح ملا یہ موقع ہرگز ضائع نہ کرنا چاہتا تھا۔ چاہے اس کی قیمت کتنی بھی اسے دینی پڑے۔

اس نے دبے پیروں سے پھر اپنے بیڈروم میں قدم رکھا اور الجھن سی محسوس کی، تہمینہ بدستور اسی طرح کسی غیر مرئی چیز پر نگاہیں جمائے سوچوں میں گم تھی۔ نہ کوئی جنبش اور نہ کوئی لفظ، عمر خیام نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا کندھا ہلایا۔

''تہمی! تہمی!'' اس نے سرگوشی کی سی آواز میں بیوی کو پکارا تو اس نے چونک کر دیکھا عمر خیام کو ایسے لگا جیسے وہ نیند سے جاگی ہو۔

''آپ کب آئے، انی کہاں ہے؟''

اس نے فکرمندی سے بیڈ سے اترتے ہوئے انعمت کی جانب دیکھا اور عمر خیام نے تیزی سے اس کا بازو تھام لیا۔

عمر کے لہجے میں برسوں پرانی شوخی کی لہر سی ابھری، تہمینہ نے اجنبی سے تاثرات کے ساتھ یہ سنتے ہوئے بھی نفی میں سر ہلایا۔

''انی کا زیادہ دیر سونا اس وقت صحیح نہیں۔ پھر خارش شروع ہوجائے گی اور پھر خوب تکلیف ہوگی۔''

تہمینہ کی آواز میں خاموش کراہیں تھیں، عمر خیام نے اپنے اندر طوفان اٹھتے محسوس کئے اور وہ مزید کچھ کہے بغیر فوراً ہی کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس رات وہ بہت دیر سے گھر لوٹا۔ پینٹ ہاؤس کی ڈوپلیکیٹ چابی سے اندر داخل ہوتے ہی وہ جم سا گیا۔ سامنے رکھے صوفے پر تہمی شاید اس کے انتظار میں تھی اور آنکھ لگ گئی تھی۔ عمر خیام نے دھیرے سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مدھم سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھری۔

''اتنی بھی کیا ناراضگی عمر کہ انسان گھر ہی نہ آئے۔''

اس کی آواز میں شکوہ گھلا تھا اور نگاہ دیوار گیر گھنٹہ پر ہوتی ہوئی عمر کے چہرے پر ٹھہری تھی۔ چار بج رہے تھے۔

عمر خیام نے ڈھیروں ڈھیر شرمندگی محسوس کی، لیکن اپنے ہر عمل میں اپنے آپ کو حق بجانب بھی محسوس کیا، کیا تھا اگر وہ کسی مہہ پارہ کے ساتھ تھا، کیا غلط تھا اگر اس نے اپنا دل مخمور کردینے والی اداؤں کی سنگت میں خوش کیا تھا۔ اس نے تو ایسا نہ

چاہا تھا۔قسمت کی ہی یہ مرضی تھی۔ اپنے آف موبائل کو آن کرتے ہوئے اس نے تہمینہ کی آنکھوں میں نمی سی اترتی ہوئی محسوس کی، جسے اس نے اپنے دل پر پھیلنے سے روکنے کیلئے اپنا رخ کمرے کی طرف کرلیا۔

''میں مجبور ہوں تہمی بالکل تمہاری طرح!'' وہ دل ہی دل میں بیوی سے مخاطب ہوتا سونے سے قبل کے کام کررہا تھا۔

''قدرت یہ ہی چاہتی ہے کہ میں غلط راہوں پر جاؤں، تب ہی ہماری زندگی کا نقشہ اس طرح تبدیل کردیا گیا ہے۔ اور میں اس کے فیصلوں کے آگے بے بس ہوں'' وہ اپنے ہر عمل کا جواز دل ہی دل میں بیوی کو پیش کرتا آنکھیں بند کرچکا تھا۔

''لیکن میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ جو مرتبہ میں نے تمہیں دیا ہے وہ کسی اور کو ہرگز نہیں ملے گا۔ میری بیوی اور میرے بیٹوں کی ماں تم ہی رہوگی'' نیند میں جانے سے قبل اس نے آخری بات تہمینہ سے دل ہی دل میں کی۔ یہاں وہ انعمت کو اپنی زندگی سے خارج کررہا تھا۔انعمت یعنی تیری نعمت، جو نعمت کو خارج کرنا چاہے اس کے پاس سے رحمت بھی بدک جاتی ہے۔

رمضان اور عید گزرے مہینے سے زیادہ ہوچکا تھا۔تہمینہ کتنے دن سے اس سے انعمت کے میڈیکل چیک اپ کیلئے ڈاکٹر کے ہاں چلنے کیلئے کہہ رہی تھی جسے وہ ٹال رہا تھا۔وہ جان چکا تھا کہ کسی بھی طرح کے چیک اپ کا کوئی فائدہ نہیں۔اس کی بیٹی امید کُش کیس ہے۔ بچوں کے مخصوص معالج کے پاس جاکر اسے مزید وحشت ہوتی تھی۔ وہاں اور کئی بچے بھی دکھائی دے جاتے تھے جن کی اور طرح طرح کی لاعلاج تکلیف دہ کیفیت ہوتی۔ جب تک اس کی امید زندہ تھی وہ ہر مہینہ باقاعدگی سے تہمینہ کے ساتھ انی کو لے کر ڈاکٹر کے ہاں جاتا رہا۔مگر وہ اب نہیں جانا چاہتا تھا اور یہ بات تہمینہ سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔سو مصروفیات کی آڑ لے کر معذرت دیتا رہا۔

آخر تہمینہ خود ہی اسے لے گئی۔عمر خیام کے لئے وہ کب تک بیٹی کا ڈاکٹر کے پاس جانا موخر کرتی جو ماں کی حیثیت سے وہ ناگزیر سمجھتی تھی۔ اسے وہاں جاکر اور بچوں کو دیکھ کر انکے والدین سے مل کر بڑا حوصلہ ملتا تھا کہ وہ کوئی اکیلی نہیں ہے جس پر یہ آزمائش ہے، کتنے اور ماں باپ ہیں جن کے جگر گوشوں کے ساتھ اور کئی طرح کے لاعلاج مسائل ہیں۔لیکن وہ پھر بھی اس امید پر آتے ہیں کہ شاید گزرے ہوئے دن میں کوئی ایسی ریسرچ ہوچکی ہو جو انکے آنکھ کے تاروں اور جگر پاروں کے دکھوں کا مداوا بن جائے۔اور یہ بھی کہ جن بیماریوں میں مبتلا ہیں وہ مزید نہ بڑھیں۔ کتنی عجیب بات تھی ایک ہی منظر عمر خیام او رتہمینہ کی نگاہ وقلب میں مختلف اثرات پیدا کرتا تھا۔ اگر وہ ممتا سے چور ماں تھی تو وہ بھی باپ تھا جو اپنی اولاد سے بے انتہا محبت کرتا تھا لیکن تقدیر سے شکوہ شکایت نے حالات سے نبرد آزما ہونے کی طاقت دینے کے بجائے فرار ہونا سکھا دیا تھا۔کامیابی کیلئے ایمان کا ہونا بے حد ضروری ہے۔رب پر جن کا ایمان نہیں ہوتا انکو اپنے آپ پر ہوتا ہے جس کے سہارے وہ دنیا میں اچھا برا جھیل لیتے ہیں، کمال اور توازن سے۔بس فرق یہ ہے کہ رب پر ایمان جن کا ہوتا ہے ان کا توازن کبھی بھی بگڑنے نہیں پاتا، باقی ہر ایمان انسان کو آخر کار خاموش دیمک کی طرح کھوکھلا کردیتا ہے کیونکہ وہ روح کی طاقت کو سلب کرکے متحرک ہوتا ہے اور یوں انسان بھربھرے تنے کی طرح رہ جاتا ہے۔

عمر خیام نے دونوں میں کسی بھی ایمان کو اپنی قوت نہ

بنایا تھا۔ اس لئے وہ بتدریج گھر او ر گھر والوں سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ گھر کے بوجھل ماحول سے اسے گھٹن ہونے لگی تھی، جہاں ہلکے پھلکے لمحات، زندہ مسکراتے جملوں اور خوش رنگ اداؤں کے بجائے کہر سی اترتی لگتی۔

بیٹے بھی ماں سے بے توجہی کا شکوہ کر جاتے، انہوں نے تو بڑی کھلکھلاتی دوست سی ماں دیکھی تھی جو نہ جانے کہاں گم ہوگئی تھی۔

''ممی بس انی کی ممی بن گئی ہیں، ایک بھائی دوسرے کو ایسے کہہ رہا تھا جیسے وہ خود اس تکلیف وہ حقیقت کو قبول کر چکا ہو اور اب دوسرے کو بھی قبول کروانا چاہ رہا ہو۔ بیکڈ فیش جو اس کے ان دونوں بچوں کی پسندیدہ ڈش تھی اب بھی تہمینہ نے کچھ دیر قبل تیار کر کے میز پر رکھ دی تھی، انکی پسندیدہ سوس بھی رکھی تھی لیکن وہ خود اچانک انعمت کے پاس چلی گئی تھی جو خادمہ کے ساتھ ہونے کے باوجود کسی بات پر روئے جا رہی تھی۔

ماں کو جاتا دیکھ کر بڑے ارحم نے اجنبی سی نگاہوں سے اسکی پشت کو دیکھا اور پلیٹ میں رکھے مچھلی کے ٹکڑے پر کانٹے کو بے سبب مارنے لگا۔ چھوٹے اشہد نے اپنے سے دو سال بڑے بھائی کو سوس پلیٹ میں ڈالتے ہوئے ذرا کی ذرا دیکھا۔

''کھانا کھاؤ اس سے لڑائی نہ کرو۔ ممی انی کی ممی ہیں بس صرف.....''

وہ بظاہر بڑی رغبت سے اپنا پسندیدہ کھانا کھا رہا تھا، ایسے جیسے اس نے حقیقتیں قبول کرنے کا گُر بارہ برس کی عمر میں ہی سیکھ لیا ہو۔ حالانکہ کل رات ہی ڈیڈی کے ساتھ ہی آئس کریم کھاتے ہوئے اداسی سے ایک دم اس کے پورے وجود کو ایسے جکڑ لیا تھا جیسے فلم میں اینا کونڈا اپنے شکار کو اپنے بل میں لپیٹ کر قید کرتا اس نے دیکھا تھا۔

رات وہ تھا، ارحم تھا اور ڈیڈی.....مگر سامنے کھڑی گاڑی میں جو فیملی تھی اس میں ڈیڈی تھے۔ دو بیٹے تھے اور ان کی ممی بھی تھیں جو بات بات پر ہنستی کبھی کبھی ہاتھ میں پکڑے کپ میں ایک چمچ کھا لیتیں۔

''یقیناً ان آنٹی کی آئس کریم گھل چکی ہوگی۔'' ارحم کی بات پر اس نے چونک کر اس کی طرف رخ کیا۔

''تو کیا وہ بھی انہی کو دیکھ رہا ہے جن کو میں دیکھ رہا ہوں۔'' اشہد نے بے اختیار سوچا اور ڈیڈی کی طرف نگاہ ڈالی تو اسے لگا ڈیڈی نے بھی اس گاڑی کو بغور دیکھا ہے۔

''کیا ہی اچھا ہو کہ انعمت ہمارے پاس نہ ہو اور ممی ہمیں واپس مل جائیں۔''

یہ سوچ اشہد کے دماغ میں آئی اور پھر اداسی۔ یہ نہ تھا کہ اس وقت بھی جب وہ گھر سے نکلے تو تہمینہ انعمت کے ساتھ مصروف تھی بلکہ شوہر اور بچوں کے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے ہوئے اسکی آنکھ لگ گئی تھی۔ سارا دن وہ اتنا کھپتی تھی کہ فرصت کے وہ لمحات جو وہ شوہر اور بیٹوں کے ساتھ گزارنا چاہتی، اس میں نیند اس پر غالب آجاتی۔

جب بچوں نے ڈیڈی سے آئس کریم کھانے کہا تو وہ بڑے پرجوش تھے۔ ویک اینڈ تھا اور بڑے عرصے بعد ممی بھی ساتھ تھیں۔ لیکن ممی کو سوتا دیکھ کر ان کا جوش خاصا دھیما ہوگیا۔ عمر نے ترحم آمیز نظروں سے بیوی کو دیکھا اور بڑے بشاش لہجے میں بچوں کو باہر چلنے پر راضی کر لیا۔

''ممی نہیں تو کیا ہوا، ڈیڈی تو ہیں شہزادوں کے۔'' اور پھر اشہد کی آئس کریم گھل گئی، اس کے سامنے موجود کسی اور کی ممی نے جیسے

اپنی ممی کی کمی کا احساس اسپر حاوی کر دیا اور وہ دو چمچ کے بعد تیسرا نہ کھا سکا۔ مگر اگلے دن وہ بیکڈفش کھا رہا تھا، سب کچھ بھلا کر، سب کچھ جھٹک کر، الٹا ارحم کو بھی سبق دے رہا تھا کہ وہ جو مل گیا اسے یاد رکھ، جو نہیں ملا اسے بھول جا.....تو.....تیز تیز قدموں سے بیٹوں کے پاس آتی تہمینہ نے گفتگو کے اچٹتے لفظ سن لیے تھے۔ وہ اب کھانا کھا کر کرسیاں کھسکاتے کھڑے ہو رہے تھے۔ مچھلی کچھ ہی کام آئی تھی۔ جبکہ یہ کھانا انکو اتنا پسند تھا کہ تہمینہ لاڈ سے انکو بیکڈفش کی دیمک کہا کرتی تھی۔ مگر اب جیسے بس چکھی گئی تھی اور وہ اٹھ گئے تھے۔

''ارے کہاں جا رہے ہو، کھانا تو کھا لو ٹھیک سے، تمہارے لئے خاص طور سے تازہ مچھلی منگوائی تھی میں نے.....فروزن میں مزہ نہیں آتا۔''

وہ جلدی جلدی بولی۔ بیٹوں کو روکنا چاہ رہی تھی۔ انکے ساتھ وقت گزارنا چاہ رہی تھی، ان پر اپنی ممتا نچھاور کرنا چاہ رہی تھی لیکن دونوں نے ہی بے تاثر چہروں کے ساتھ ماں کو دیکھا، شکوے کی لہریں ارحم کی نگاہوں میں لمحہ بھر کے لئے ابھریں پھر معدوم ہو گئیں۔ ''ہمیں یہ کھانا پسند تھا جب انعمت نے ہماری ممی پر قبضہ نہ کیا تھا۔''

اشہد کے الفاظ میں کاٹ تھی مگر لہجہ سپاٹ تھا۔ بس آنکھوں میں نمی نے دھندلاہٹ پھیلا دی۔

بچے جا چکے تھے وہ کرسی کی بیک تھامے کتنی دیر وہاں اسی عالم میں کھڑی رہی۔ ٹیلی فون کی تیز آواز اسکے قریب سے گونجی تو اسے گردن ترچھی کر کے کچھ فاصلے پر رکھے کارڈلیس کو ایسی اجنبی نگاہوں سے دیکھا جیسے وہ اسکو جانتی نہ ہو۔ دھیرے سے اٹھ کر اس نے غائب دماغی سے فون ریسیو کر لیا۔ دوسری جانب عمر خیام تھا، آواز میں فکرمندی سموئے وہ اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ مگر اس کی غائب دماغی ایسی تھی جیسے سمجھنے کی پروسیسنگ عارضی طور پر بند ہو چکی ہو۔ چپ چاپ ریسیور تھامے وہ سمجھنا چاہ رہی تھی کہ اس کا شوہر کیا کہہ رہا ہے لیکن لاحاصل کوشش۔ کچھ لمحوں بعد جب اس نے دوسری جانب خاموشی محسوس کی تو ریسیور رکھ کر ادھر آ گئی جہاں خادمہ انعمت کے ساتھ گیند سے کھیل رہی تھی۔ اب سے گھنٹہ بھر قبل وہ اس بری طرح مچل کر رو رہی تھی کہ اس کو خود سنبھالنا پڑا تھا۔ اور اب وہ مگن تھی۔ ''انعمت کی ممی!'' ذہن میں بیٹے کا یہ فقرہ گونجا تو وہ بے اختیار آسمان کو دیکھنے لگی۔ ''یا اللہ رحم!'' دل نے یہ فقرہ پوری شدتوں سے ادا کیا اور وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گئی۔

میری زندگی تو ڈراؤنا خواب بن گئی ہے۔ جو کسی طرح ختم ہی نہیں ہو رہا۔ عمر خیام نے جھنجلا کر سوچا۔ گھنٹہ بھر کی کوشش کے بعد تہمینہ سے رابطہ ہوا تو بھی ہیلو کہنے کے بعد بس ''جی، ٹھیک ہے'' کے علاوہ کچھ نہیں بولی۔ صاف ظاہر تھا دماغ کہیں اور ہے۔ یہ صرف انعمت کی ماں بن گئی ہے۔.....صرف انعمت کی ماں! اسے آج بیوی پر بے حد غصہ آ رہا تھا،

''میں پوچھ رہا تھا کہ بیڈروم کی میز پر کوئی سی ڈی تو نہیں دیکھی تو کہہ رہی ہے جی، کیا بات ہے.....پوچھا تمہاری آواز عجیب سی کیوں ہو رہی ہے تو کہہ رہی ہے ٹھیک ہے۔''

عمر خیام نے فون پر ہونے والی گفتگو کو سوچتے ہوئے تہمینہ کیلئے ناگواری محسوس کی اور سامنے رکھے کاغذ کا گولا بنا کر دیوار کی جانب اچھال دیا۔ اس کا دماغ منتشر ہو رہا تھا۔ اپنا موبائل تھام کر اس نے کچھ نمبر دبائے اور دوسری جانب مترنم سی آواز سن کر اسکے تنے اعصاب جیسے ڈھیلے ہوتے چلے گئے۔

(جاری ہے)

☆☆☆

# امّ جمیل زوجہ ابولہب

ایک ایسی گناہ گار عورت کی کہانی جس کے ساتھ اس کے گناہ گار شوہر ابولہب کی مذمت میں پوری ایک سورۃ نازل ہوئی۔ پورے قرآن مجید میں حضورؐ کے دشمنوں کے ذکر میں کسی کا نام نہیں لیا گیا سوائے ابولہب کے ۔ سورۃ اللھب میں اس کا اور اس کی بیوی کا اگلی دنیا کا واضح انجام دکھایا گیا ہے۔

ترجمہ: ''ٹوٹ گئے ابولہب کے ہاتھ اور نامراد ہوگیا وہ اور اس کا مال جو کچھ اس نے کمایا وہ اس کے کام نہ آیا۔ ضرور وہ شعلہ زن آگ میں ڈالا جائے گا اور اس کے ساتھ اسکی بیوی بھی جو لکڑیاں ڈھونے والی ہے۔ اسکی گردن میں مونجھ کی رسی ہوگی۔ (اللھب )

ابولہب کی بیوی کا نام اروٰی تھا اور اسکی کنیت ام جمیل تھی۔ یہ حرب بن امیّہ کی بیٹی اور ابوسفیان کی بہن تھی۔ یہ کوئی معمولی عورت نہ تھی یہ اپنے معاشرے کی نہایت باعزت خاتون تھی۔ ابولہب بنو ہاشم کے چار امیر ترین لوگوں میں سے ایک تھا اور بنو ہاشم پورے عرب کے سردار تھے۔ اس کے شوہر کا جو مرتبہ حکومت میں تھا اسے دیکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو درجہ و مرتبہ حکومت کے سربراہ کی بیوی کو حاصل ہوتا ہے وہی اسے بھی حاصل تھا یعنی خاتونِ اول کا۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ قریش کی عورتوں کی سردار تھی۔ یہ بگڑی ہوئی بیگمات کی طرح فیشن کی دلدادہ، زیورات کی شوقین، دولت کی حریص اور نمائش کی رسیا تھی۔ دولت وثروت اور معاشرے میں بلند مقام ومرتبے نے اسکے مزاج کو بھی بے حد بگاڑ دیا تھا۔ وہ خاصی بدزبان اور جھگڑالو تھی۔ نبیؐ کے خلاف بدزبانی کرنا، افترا پردازی سے کام لینا، فتنے کی آگ بھڑکانا اور خوفناک جنگ برپا کرنا اس کا شیوہ تھا۔ وہ اپنے گلے میں ایک بے حد قیمتی مزین ہار پہن کر اتراتی پھرتی اور کہتی کہ میں یہ ہار بیچ کر نبی کریمؐ کی عداوت میں خرچ کروں گی۔

ابولہب، حضورؐ کا سگا چچا تھا۔ اس کا اصل نام عبدالعزیٰ تھا۔ اسے ابولہب اس لئے کہا جاتا تھا کہ اس کا چہرہ خوب صورت، رنگ چمکتا ہوا سرخ وسفید تھا۔ لہب آگ کے شعلے کو کہتے ہیں اور ابولہب کے معنی ہیں شعلہ رو، اسکی آنکھ بھینگی تھی اور اس کے سر پر بڑے بالوں کی دو مینڈھیاں تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا نام لے کر اسکی مذمت فرمائی کیونکہ عرب معاشرے کے دستور کے مطابق سگا چچا باپ کا درجہ رکھتا تھا لیکن یہ اسلام دشمنی میں حد سے بڑھا ہوا تھا۔ اس سے جس حد تک ممکن تھا اس نے نبی کریمؐ کو اذیت پہنچائی اور لوگوں کیلئے یقین کرنا مشکل تھا کہ باپ برابر چچا بھی اس حد تک دشمنی کرسکتا تھا۔ نبوت سے پہلے رسولؐ کی دو صاحبزادیاں حضرت رقیہؓ اور حضرت ام کلثومؓ ابولہب کے دو بیٹوں عتبہ اور عتیبہ سے بیاہی ہوئی تھیں۔ ابھی نکاح ہوا تھا رخصتی نہیں ہوئی

تھی۔ مکہ میں دونوں یعنی رسولؐ اللہ اور ابولہب کے گھر ساتھ ساتھ تھے درمیان میں ایک دیوار مشترکہ تھی۔ نبوت کے بعد جب حضورؐ نے لوگوں کو اسلام کی دعوت دینی شروع کی تو اس شخص اور اس کی بیوی ام جمیل نے اپنے دونوں بیٹوں سے کہا کہ ہمارے لئے تم سے ملنا حرام ہے جب تک تم دونوں محمدؐ کی بیٹیوں کو طلاق نہ دے دو۔ چنانچہ دونوں نے ماں باپ کے کہنے پر طلاق دے دی۔ جس کا حضورؐ کو بہت صدمہ پہنچا۔ اور عتبہ تو جہالت میں اس حد تک بڑھ گیا کہ ایک روز حضورؐ کے سامنے آ کر اس نے انکی نبوت کا انکار کیا اول فول بکتا رہا اور آپؐ کے روئے مبارک پر تھوکا جو آپؐ پر نہیں پڑا اسکی اس حرکت سے آپؐ کو دلی آزار پہنچا۔ آپؐ نے فرمایا یا اللہ اپنے کتوں میں سے کسی ایک کتے کو اس پر مسلط کر دے۔

اسکے چند روز بعد عتبہ اپنے باپ کے ساتھ شام کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ دورانِ سفر قافلے نے ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ جہاں مقامی لوگوں نے بتایا کہ یہاں راتوں کو درندے آتے ہیں۔ ابولہب نے اپنے ساتھی قریش سے کہا کہ میرے بیٹے کی حفاظت کا کچھ انتظام کرو کیونکہ مجھے محمدؐ کی بددعا کا خوف ہے اس پر قافلے والوں نے عتبہ کے گرد ہر طرف اپنے اونٹ بٹھا دیئے اور پڑ کر سو رہے۔ رات کو شیر آیا اور اونٹوں کے حلقے سے گزر کر اس نے عتبہ کو پھاڑ کھایا۔ یوں حضورؐ کی شان میں گستاخی کی سزا اسے اللہ کی طرف سے مل گئی۔

ام جمیل اسلام دشمنی میں اپنے شوہر کی طرح پیش پیش تھی۔ رشتہ داری ٹوٹنے کے بعد تو یہ حد سے گزرنے لگی تھی۔ اب تو اس کے ساتھ اسکی دیکھا دیکھی حضورؐ کے دیگر ہمسائے بھی آپ کو ایذا پہنچانے میں شریک ہو گئے۔ کبھی آپؐ نماز پڑھ رہے ہوتے تو بکری کی اوجھری یا بچہ دانی آپؐ کے اوپر پھینک دیتے۔ کبھی صحن میں کھانا پک رہا ہوتا تو یہ لوگ ہنڈیا پر غلاظت گرا دیتے۔

ام جمیل نے تو روزانہ کا معمول بنا رکھا تھا کہ وہ خاردار جھاڑیاں چن کر لاتی اور آپؐ کے گھر کے دروازے کے باہر رکھ دیتی تا کہ صبح سویرے آپؐ یا آپؐ کے گھر میں سے کوئی بھی باہر نکلے تو اسکے پاؤں میں کانٹا چبھ جائے۔ کئی سالوں تک اسکا یہی معمول رہا اور آپؐ اپنے ہاتھوں سے راستہ صاف کرتے اور دروازے میں کھڑے ہو کر فرماتے۔ ''اے بنی عبد مناف! یہ کیسی ہمسائیگی ہے۔؟

جب یہ لوگ اذیت دینے اور دل آزاری کرنے میں حد سے بڑھ گئے تو اللہ تعالیٰ نے سورۃ لہب نازل فرمائی اور اس میں واضح طور پر نام لے کر بتا دیا گیا کہ یہ دونوں میاں بیوی دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔

حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی حضرت اسماءؓ کا بیان ہے کہ جب سورۃ اللھب نازل ہوئی ام جمیل نے اسے سنا تو وہ بپھری ہوئی رسولؐ کی تلاش میں نکلی اس کے ہاتھ میں مٹھی بھر پتھر تھے اور وہ حضورؐ کی ہجو میں اپنے ہی کچھ اشعار پڑھتی جا رہی تھی۔ حرم میں پہنچی تو وہاں حضورؐ کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ بھی بیٹھے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا یا رسولؐ اللہ یہ آ رہی ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ آپؐ کو دیکھ کر یہ کوئی بے ہودگی کرے گی۔ حضورؐ نے فرمایا یہ مجھ کو نہیں دیکھ سکے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا آپؐ موجود ہونے کے باوجود وہ آپؐ کو نہ دیکھ سکی اور اس نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا میں نے سنا ہے تمہارے صاحب نے میری ہجو کی ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا اس گھر

کے رب کی قسم انہوں نے تو تمہاری کوئی ہجو نہیں کی۔ اس پر وہ واپس چلی گئی۔ حضرت ابوبکرؓ کا مطلب یہ تھا کہ اسکی ہجو تو اللہ تعالیٰ نے کی ہے حضورؐ نے نہیں کی۔

اب دیکھئے اللہ تعالیٰ نے اس دشمن رسولؐ کی آخرت کی کیا تصویر کشی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اس روز وہ ذلت میں گرفتار ہوگی۔ جس ہار کو پہن کر وہ اتراتی تھی قیامت کے دن وہ موٹی سی رسی میں بدل جائے گا۔ اس کی مثال اس لونڈی کی سی ہو جائے گی جو گلے میں رسی ڈال کر لکڑیاں چننے جا رہی ہو۔ جس آگ میں ابولہب جل رہا ہوگا اس آگ میں وہ لکڑیاں لا لا کر ڈالے گی جس سے آگ اور زیادہ بھڑکے گی۔ وہ رسی جو اس کی گردن میں ہوگی اس کے بارے میں عروہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں کہ جہنم کی زنجیر ہے جس کی ایک ایک کڑی ستر گز کی ہے جس سے اسے کھینچ کر جہنم کے اوپر لایا جائے گا پھر اس زنجیر کو ڈھیلا چھوڑ کر جہنم کی تہہ میں پہنچایا جائے گا۔ یہی عذاب اسے ہوتا رہے گا۔ ڈول کی رسی کو عرب ''مسد'' کہا کرتے تھے۔ قرآن میں بھی یہی لفظ استعمال ہوا ہے۔ ابولہب بھی اپنی بیوی ام جمیل کی طرح کفر کی حالت میں مرا۔ اس کا نہایت دردناک انجام ہوا جو دنیا کے لیے عبرت انگیز ہے۔ ابولہب نے جنگ بدر میں کفار کی طرف سے لڑنے سے انکار کر دیا موت کے خوف سے گھر بیٹھا رہا۔ بعد ازاں اسے عدسہ کی بیماری (malignant pustle) ہوگئی جو ایک طرح کا طاؤن تھا اور اسے چھوت کی بیماری کہا جاتا تھا۔ اس بیماری میں چھوت کے اندیشہ سے نہ اس کے ساتھیوں نے اس کی خبر گیری کی نہ اس کے بیٹوں اور خاندان کے عزیزوں نے اس کا حال پوچھا۔ اسی بے بسی کی حالت میں اس نے جان دے دی اور لاش کئی دن تک گھر میں پڑی سڑتی رہی۔ بالآخر لوگوں کے طعنوں سے تنگ آ کر اس کے بیٹوں نے کرایہ کے کچھ حبشیوں کی مدد سے لاش مکہ کے بالائی حصہ میں پھنکوائی۔ پھینکنے والوں نے لکڑیوں کی مدد سے لاش کو دھکیل کر کھدے ہوئے گڑھے میں پھینکا اور دور ہی سے اس پر پتھر وغیرہ پھینک کر ڈھانک دی۔ دور سے پتھر پھینکنا لعنت کرنے کے ہم معنی ہے۔ اس طرح اس ملعون شخص کو نبی کریمؐ کی توہین کرنے اور ان کو اذیتیں پہنچانے کی دنیا میں بھی سزا ملی اور آخرت کی سزا پر تو پوری سورت نازل فرما دی گئی۔ قرآن کے واضح الفاظ میں اس کی اور اس کی بیوی کی سزا کی منظر کشی کر دی ہے۔

ام جمیل کو کس طرح موت آئی، اس کے بارے میں تاریخ خاموش ہے۔ ان دونوں کو اسلام دشمنی میں مکمل شکست اس طرح ہوئی کہ جس دین کی راہ کو روکنے کے لیے انھوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اسی دین کو ان کی اولاد نے قبول کر لیا۔

سب سے پہلے ان دونوں کی بیٹی درہؓ اسلام لے آئیں اور انھوں نے مدینے کی طرف ہجرت کی اور دونوں بیٹوں عتبہؓ اور معتبؓ نے فتح مکہ کے موقع پر حضرت عباسؓ کی وساطت سے آپؐ کے دست مبارک پر بیعت کی اور اسلام قبول کیا۔

نوٹ: اس مضمون کی تیاری کے لیے تفہیم القرآن از مولانا مودودی، تدبر قرآن از مولانا امین احسن اصلاحی سے مدد لی گئی۔

☆☆☆

# چلتے چلتے

''آسٹریلوی وزیراعظم جولیا گیلارڈ اس سال تیسری بار گر پڑیں۔ اپنے سینڈلوں کے سبب تیسری بار مشکل کا شکار ہوچکی ہیں۔تازہ ترین واقعہ بھارت کے دارالحکومت دہلی میں ہوا۔''

بھئی نازک سے سینڈل کے بغیر شخصیت ہی نہیں بنتی ویسے بے شک درگت بن جائے۔اب دہلی میں جو تصویر میں سجدہ ریز دکھائی دے رہی ہیں اس سے تو کہیں بہتر تھا کہ فلیٹ شوز پہن کر گارڈ آف آنر کا بڑی آنر سے معائنہ کررہی ہوتیں،مگر ہائے رے یہ نزاکت ونفاست جو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے نہیں دے رہی۔ ابھی شکر کریں ٹانگ کی ہڈی وغیرہ نہیں ٹوٹ گئی۔تیسری مرتبہ گری ہیں مگر ایڑی والے سینڈل نہیں چھوڑے۔

''دفتر میں بیٹھ کر خوشی فراہم کرنے والی کرسی بنالی گئی''

کرسی کی محبت پہلے ہی ہمارے ہاں کیا کم تھی جواب خوشی فراہم کرنے والی کرسی بھی بازار میں آ گئی ہے۔ویسے ہمارے ہاں اس کرسی کی زیادہ ضرورت نہیں کہ لوگ ویسے ہی اپنے لئے خوشیاں فراہم کر لیتے ہیں جیسے لال لال نوٹ دیکھ کر ہمارے بہت سارے کرسی نشین خوش ہوجاتے ہیں عام لکڑی کی کرسی پر بیٹھ کر بھی۔ان نوٹوں میں بڑی کشش ہے روپے کے ہوں یا ڈالر کے۔ ہر جگہ نوٹوں کی بہار ہے۔نوٹوں کے لئے بھی فریاد ہے۔نوٹوں ہی سے موسم سازگار ہے۔

؎ فائل دبا کے رکھی تھی میری کلرک نے
دیکھے جو نوٹ ، بولا کہ انکار کیا کریں

ویسے بھی ہمارے ہاں اقتدار کی کرسی اپنے اندر ایسی ایسی فرحت وراحت رکھتی ہے کہ یہ خوشی فراہم کرنے والی کرسی بھی اس کی ریس نہیں کرسکتی۔ چند لاکھ لگائیں۔الیکشن میں آئیں کچھ مزید گڑ ڈالیں اور پھر منتخب ہوکر اقتدار کی مٹھاس چکھیں۔دونا سوا دنہ آیا تو پھر کہیے گا۔ہاں اگر زرداری صاحب جیسے شخص سے بگاڑ لی تو پھر اقتدار بھی پلو چھڑا لے گا جیسے گیلانی صاحب بے دھیانی میں مارے گئے ہیں یا بے ایمانی سے۔ بہرحال اب مارے مارے پھر رہے ہیں اور حاصل کچھ بھی نہیں ہورہا۔الٹا مرے تھے جن کے لئے انہی کے در دولت پر ان کے صاحبزادے صاحب کو ہتھکڑی لگ گئی ہے۔

؎ کام کے لوگ چند ملتے ہیں
سینکڑوں درد مند ملتے ہیں
جب مصیبت کا وقت آتا ہے
راستے سارے بند ملتے ہیں

ویسے بھی خوشی فراہم کرنے والی کرسی اتنی گراں قیمت کی ہے کہ ایک ہی خریدی جاسکے گی۔تو کیا گھر جاتے ہوئے یہ مرد حضرات اس کرسی کو اٹھا کر ساتھ لے جائیں گے؟ گھروں میں ان صاحب لوگوں کی خوشیوں کا درجہ کافی نہیں ہوا کرتا ہے۔خوشی اور سکون تو اللہ کے ذکر میں ہے۔یہ کرسی میں سکون ومسرت کہاں سے آ گیا.....؟انور شعور کہتے ہیں۔

؎ کب کسی کی ہوئی یہ ہرجائی
کس پہ آخر جفا نہیں کرتی
جان دیتے ہیں لوگ کرسی پر
اور کرسی وفا نہیں کرتی

''طوطے تین سالہ بچے جتنے ذہین ہوتے ہیں''

نہ جانے کیوں یہ خبر پڑھتے ہی ہمیں یہی ایک خیال آیا کہ کاش! ہمارے سیاستدان اورارباب اختیار طوطے ہی ہوتے! تین سالہ بچے ہی سہی مگر ذہانت تو کچھ ہوتی۔ انکی حرکات وسکنات دیکھ،سن کرتو اندازہ ہوتا ہے کہ الوبھی ان سے کہیں زیادہ عقلمند ہے۔غضب تو یہ ہے کہ یہ چوری تو خوب کھاتے ہیں مگر ذہانت کے معاملہ میں طوطوں سے لگانہیں کھاتے۔طوطا بھی کبھی ٹیں ٹیں کرتا ہے مگر یہ تو ہر وقت نہیں نہیں کی رٹ لگائے رکھتے ہیں۔یقین نہ آئے تو ایک تازہ خبر پڑھ لیجیے جس میں ڈاکٹروں نے رحمٰن ملک کے بولنے پر پابندی لگادی ہے۔کراچی میں کئی مہینوں سے ٹارگٹ کلنگ کا گھناؤنا کھیل جاری ہے۔بلوچستان کے حالات سنبھلنے میں نہیں آرہے رشوت، کرپشن ہر کہیں عام ہے مگرہم برسوں سے امریکہ کے غلام ہیں۔غیرت وقوت سب نیلام ہیں۔قہر، جبر بہت عام ہے۔طاقت کوسلام۔غریب پہ شام ہی شام ہے۔

''امریکہ میں دنیا کا سب سے بڑا سانپ پکڑا گیا''

کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی اس خبر سے۔مزا تو تب تھا جو امریکی بڑا سانپ پکڑا جاتا۔پھر اخبارات میں شہ سرخیاں لگتیں'' دنیا بھر میں سب سے بڑا امریکی سانپ پکڑا گیا'' پھر خبر کی تفصیل میں بتایا جاتا کہ اس سانپ نے دنیا بھر میں خاص کر اسلامی ملکوں میں کاٹ کھانے کا بازار گرم کر رکھا تھا۔خاص کر اسلامی ممالک اوران میں بسنے والے راسخ العقیدہ مسلمان اس کے زہر کا خاص نشانہ بنتے رہے ہیں۔صدشکر کہ اس وقت امریکی سانپ کافی مشکلات میں ہے۔وہ دن دورنہیں جب اللہ کے فضل وکرم سے مسلمان اس کا سرکچل دیں گے۔اس سانپ نے اسلامی ملکوں میں ایسی آگ لگائی ہے کہ آگ وخون کا بازار گرم کردیا ہے۔

؎ مگر یہاں تو جل رہا ہے آدمی سے آدمی
سنا یہ تھا چراغ سے چراغ جلتے آئے ہیں

''امریکہ میں آزادی کی لہر:20ریاستوں میں علیحدگی کا مطالبہ۔حکومتی پالیسیاں معاشی خوشحالی کے ناموافق ہیں۔ علیحدگی کی پرامن اپیل کرتے ہیں۔پٹیشن میں موقف 25ہزار افراد نے دستخط کردیئے تو اوباما انتظامیہ اس پرغور کرنے کی پابند ہوگی۔''

مزے کی بات یہ ہے کہ اب تک ہزاروں افراددستخط کرچکے ہیں اسے کہتے ہیں کدے چاچے دیاں کدے بابے دیاں گویا

؎جوجلاتا ہے کسی کو، وہ بھی جلتا ہے ضرور

اسلامی ملکوں کولخت لخت کرنیوالے۔یہاں ہرکہیں ڈوئی پھیرنے والے آج اپنے لخت لخت ہوتے ماحول کو کیسے سنبھالیں گے۔مولانا مودودیؒ نے ساٹھ پینسٹھ سال پہلے واشنگٹن اور ماسکو کے زوال کی پیش گوئی کردی تھی۔

ماسکو کے بارے میں تو پوری ہوچکی اب واشنگٹن میں زلزلے کے آثار پیدا تو ہوئے ہیں۔بیس ریاستوں سے بات بیالیس تک پہنچ جائے گی۔اور پھر ورلڈ آرڈر مرڈر آرڈر کا روپ

دھارلے گا۔ سچی بات ہے بے وسیلہ لوگ ظالم کے ظلم کی فریاد اشکبار آنکھوں سے قادر مطلق کے حضور ہی کر سکتے ہیں سو اہل پاکستان گزشتہ گیارہ سال سے کرتے آرہے ہیں۔

ے ڈاھڈے دے ہتھ قلم محمدؐ تے وس نہیں کوئی
چلنا
لِسّے داکیہ زور محمدؐ! نس جانا یا رونا

امریکہ سب بڑی جمہوریت۔ اسلحے کے انبار لگانے والا لیکن افغانستان کی بے کار جنگ میں اپنا سب کچھ جھونکنے کے باوجود نامراد رہنے والا۔ بنک دیوالیہ ہورہے ہیں ۔قرضوں کا بوجھ بھاری ہوتا جارہا ہے لیکن پردھان منتری بننے کے شوق میں اتحادی افواج کے سائے تلے مسلمان ملکوں میں دہشت گردی کا بازار گرم کر رکھا ہے وہ بھی امن کے نام پر۔ کیا منافقت سی منافقت ہے۔سو منطقی انجام کی طرف بڑھ رہا ہے۔

ے سوال یہ نہیں طرزِ حکومت اچھا ہے
سوال یہ ہے برائے رعیت اچھا ہے؟

اوراب رعیت ہی نے تو علیحدگی کی درخواستیں داغ دی ہیں۔ ابھی سینڈی کی صورت میں عذاب بھگتا ہے۔آگے نہ جانے کیا کیا دیکھے گا۔مثل مشہور ہے ہر کمالے را زوالے

ے وقت کا ہو سکندر و دارا
موت سے ایسی مات کھاتا ہے
جیسے مکڑی کے جال میں انورؔ
جو بھی پھنستا ہے ، پھڑ پھڑا تا ہے

رہے نام اللہ کا!

☆☆☆

# وقتِ حضوری

''کل ۸ ذی الحج ہے مصروف ترین دن ہے۔ ہماری منیٰ روانگی بھی کل ہے اس کے ساتھ ہی ہم اللہ کے ان منتخب بندوں میں شامل ہوجائیں گے جو گناہوں کی بخشش اور رحمت کے امیدوار بن کر حج کا فریضہ ادا کریں گے۔'' میں نے اپنے گروپ کی دونوں خواتین مسرت اور شاہدہ کو بتایا۔

''لیکن نیچے تو نوٹس لگا ہے کہ ہم نے آج رات نو بجے منیٰ روانہ ہونا ہے۔'' دونوں میں سے ایک نے کہا

''کیا'' میرا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا'' آج تو ۷ ذی الحج ہے''

پھر اپنی دوست کے الفاظ یاد آئے کہ عرب لوگ فتویٰ کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے یہ سوچ کر راضی برضائے معلم ہوگئی۔ دوسری صورت میں معلم کا فرمان تھا کہ جس نے آج نہیں جانا وہ کل ازخود جائے..... پیدل۔

نو بجے نہا دھو کر احرام باندھے دل میں جھانک کر دیکھا، حج کی چاہت شوق، ولولہ تمام امیدوں آرزؤں پر حاوی ہو چکا تھا۔ کوئی پر لگائے اور منیٰ پہنچ جاؤں والی کیفیت تھی۔ معلم کے رات نو بجے کا مطلب صبح کے چار بجے تھا۔ ساری رات سونے جاگنے کی درمیانی کیفیت میں گزری۔ پلنگ پر لیٹنے کا ارادہ کرتے تو معلم کا نمائندہ ''بس آنے والی ہے'' کا پیغام لئے آجاتا اس اثناء میں دو مرتبہ چائے بنا کر پی۔ کچھ ذکر اذکار نوافل کا بندوبست کیا مگر بس نے چار بجے آنا تھا وہ چار بجے آئی اور حرم کے دو چکر لگا کر سات آٹھ منٹ میں منیٰ پہنچ گئی۔ کچھ دن قبل اپنی سٹوڈنٹ کی والدہ ثمینہ امجد کے ہمراہ منیٰ بھی گئے تھے۔ لیکن اس منیٰ اور اس منیٰ میں بہت فرق تھا۔

منیٰ میں سوق العرب مکتب چالیس کے سامنے بس رکی تو فجر کی اذان سنائی دے رہی تھی سڑکیں .....لوگ..... خیمے.....چہل پہل.....

''ارے یہ منیٰ ہے؟'' میرا تصور دھڑام سے زمین بوس ہوگیا۔

کیمپ میں داخل ہوئے تو فائیو سٹار نہ سہی فور سٹار خیمے حاضر تھے۔ موٹے سرخ قالین پر بمشکل دو بالشت چوڑے گدے۔ سرہانے پڑی پیکنگ میں پلاسٹک مگ، تکیہ اور چادر۔ اے سی کی ٹھنڈک۔

سعودی عرب کی طرح منیٰ کے متعلق بھی میرا تصور لق ودق میدان کا تھا جس میں کہیں کہیں خیمے سر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ یہاں آئے تو لگا شاید اس سے زیادہ گنجان آباد علاقہ کوئی اور نہیں۔ اتنی سہولتیں پا کر میرا دل بجھ سا گیا۔ آنکھ میں پانی سا جم گیا۔

''میرے محبوب آپؐ پر کروڑوں سلام، کیا آپؐ کو ایسا ہی منیٰ ملا تھا۔؟''

''ارے یہ کیا!!'' حیرت سے سب گنگ ہوگئے دو جوان جہان مرد احرام باندھے یہ بستر میرا ہے پر دھینگا مشتی کر رہے

تھے۔ گالم گلوچ کے بعد ایک دوسرے کی تھپڑوں اور مکوں سے تواضع کی۔ دونوں اے سی کے قریب والے گدے پر جگہ لینا چاہتے تھے۔

استغفراللہ! ہائے یہودی نہ یہ دیکھ لیں۔ دنیا فتنہ ہے۔ چودہ سو سال قبل کی سرگوشی یاد آئی دنیا کا عیش بھی فتنہ ہے۔

اشتیاق صاحب نے بڑی مشکل سے ان کی لڑائی ختم کرائی۔ ایک دو احادیث سنائیں۔ میرا دل دھاڑیں مار کر رونے کو چاہ رہا تھا۔

چاروں طرف مرد، عورتیں، شور شرابہ۔ باتیں، مجھے وہ تنہائی کہاں سے ملے گی منیٰ میں جو اس کی وی آئی پی نسبت سے درکار ہے۔ میں نے سوال کیا۔

کاش ہم خالی ہاتھ آجاتے۔ میں نے سرہانے رکھے بیگ کو دیکھ کر کہا۔ ہر ایک نے یہی مشورہ دیا تھا چادر ضرور رکھ لینا منیٰ کیلئے.....اور تکیے بھی.....دوسرا مشورہ۔

منیٰ میں سوکھے راشن کا بندوبست ضرور کرنا۔ میرے کیمپ میں چاروں طرف مخلوط ماحول تھا۔ مرد عورتیں، قہقہے!! حج کا ماحول نہیں لگ رہا تھا۔ ٹینشن سے میرے سر میں درد شروع ہوگیا۔

کچھ لوگوں نے معلم کے نمائندے سے مل کر مردوں کے لئے کیمپ کی پارٹیشن کردی۔ زیادہ تو نہیں نسبتاً تنہائی مل گئی۔ وگرنہ تو یہ صورت حال تھی سامنے والی خاتون کی بات کا جواب دیتی تو پندرہ بیس مرد سامنے نظر آتے۔ دائیں طرف منہ اٹھاتی تو مردوں کا قافلہ اترا محسوس ہوتا پیچھے منہ چھپانا چاہتی تو ساری قطار ہی مردوں کی تھی۔

''تعلق باللہ'' کی جو کیفیت مطلوب تھی وہ قطعی مفقود تھی۔

چودہ سو سال قبل کے حج میں یہ دنیا نہیں تھی۔ میں نے فائر پروف خیمے ٹیوب لائٹس اے سی دیکھ کر سوچا دنیا آتی ہے تو آزمائشیں ساتھ لاتی ہے!

میرا دل بہت اداس تھا، اللہ آپ تو جانتے ہیں میں نے حج کیلئے کیا کیا خواب دیکھے تھے۔ ان کی تعبیر پرنٹ، ڈیزائن، سوٹوں کی قیمت پر گفتگو کرتی، خواہش کے ہجوم میں نہیں مل سکتی۔ منیٰ .....بچپن سے کان اس ننھے منے لفظ سے مانوس تھے۔ اکثر ذہن میں سوال اٹھتا، منیٰ میں وہ کیا خاص بات ہے کہ اللہ نے اس کو ''خاص سٹیشن'' بنایا ہے!!

مکہ سے منیٰ پہنچو۔ مزدلفہ سے منیٰ آؤ طواف زیارۃ کے لئے جاؤ تو واپسی منیٰ کی طرف، تین دن جمرات جاؤ رمی کیلئے۔ آنا پلٹ کے منیٰ میں ہے!!

منیٰ تو کیسا بھید ہے میرے اللہ کا؟

اس کا جواب حج سے دس بارہ دن قبل درس قرآن کے دوران مولانا عبدالرحمٰن مکی صاحب نے دیا۔

منیٰ میں لاکھوں حاجی جمع ہوتے ہیں کوڑا گندگی، اور باسی کھانوں کے ڈھیر ہوتے ہیں لیکن کوئی مکھی، مچھر، ٹڈی یہاں تک کہ منیٰ میں چار روزہ قیام کے دوران کوئی چیونٹی تک نظر نہیں آتی۔ دوسرا یہ کہ لاکھوں حاجی، منیٰ میں قربانیاں پیش کرتے ہیں کبھی کوئی ایک چیل یا کوا کسی نے نہیں دیکھا۔

تیسرا یہ کہ منیٰ میں لاکھوں کیا کروڑوں لوگ بھی جمع ہونا چاہیں تو منیٰ انہیں سمیٹ لے گی۔

مکی صاحب نے اور بھی فضائل بتائے ہوں گے جو سنے نہ جاسکے۔

لیکن چار روزہ قیام میں منیٰ کے قیام نے مجھ پر منیٰ کی

اہمیت واضح کردی۔ ایک دم میں نے سوچا کہ عرب عجم کے لاکھوں حاجی یہاں جمع ہیں۔ انسانوں کا سمندر، سر ہی سر، کس کی یاد میں؟

سلامٌ علیٰ ابراہیمؑ مجھے عجیب سا محسوس ہورہا تھا۔ ایک بندے نے اس مقام پر اپنے رب کی لاج رکھی۔ اس کا مان بڑھایا۔ اپنی برادری، قبیلہ، جائے پیدائش، عہدے چھوڑ کر اپنے آپ کو آگ کے حوالے کردیا۔ وہی بندہ اپنی اولاد..... آپکی آنکھوں کی ٹھنڈک، دل کے ٹکڑے کو اسی منیٰ میں ذبح کرتا ہے۔ وہ جو فرشتوں نے سوال کیا تھا۔ ''نحن نسبح بك ونقدس لك'' کیا کمی تھی ہم میں یاالٰہ۔ کیا ہم نے تیری تسبیح تحمید میں کمی کی؟ جواب آیا.....

فرشتو! تم نہیں جانتے جو میں جانتا ہوں! یہ خاکی مخلوق..... گوجلد باز، بھلکڑ، تھڑدلی ہے لیکن کرنے پر آئے تو..... اپنے آنکھوں کے نور، دل کے سرور، جگر کے ٹکڑے کو میرے حکم پر قربان کرسکتی ہے!

منیٰ میں اسماعیلؑ کے گلے پر چھری رکھ کر میرے رب کا تخلیق آدمؑ کا مقصد ابراہیمؑ نے پورا کردیا۔

رب کا مان بڑھایا۔

منیٰ تیری عظمت بجا ہے!

میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میری آنکھوں سے بھل بھل آنسو بہنے لگے۔

وہ جگہ جسے حیرت سے فرشتوں نے دیکھا ہوگا۔ جہاں بوڑھے ضعیف باپ نے کس طرح کانپتے ہاتھوں سے یہ قربانی کی ہوگی۔

اور..... اور میرے اندر سے کسی نے سرگوشی کی۔ ''کیا تم جانتی ہو، وہ جگہ جہاں ابراہیمؑ نے رب کے امتحان پر پورا ترنے کے سو بٹا سو نمبر لئے۔ عین ممکن ہے یہ وہی جگہ ہو..... جسے رب کے تمام مقربین نے رشک سے دیکھا ہوگا۔ یہ رشک اس جگہ کو مقامِ نزولِ عرش الٰہی کا باعث بنادے!''

میرے ذہن میں جگہ جگہ سے جھانکتی نگاہیں آئیں۔ حیرت سے انگلیاں دانتوں تلے دباتی۔

ابراہیمؑ نے جہاں سرخروئی حاصل کی رب اسی جگہ پر اپنا عرش اتارے۔

یہ خیال آنا تھا کہ مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی۔ منیٰ، جہاں اللہ حاجیوں کو بار بار بلاتا اور اس جگہ سے مانوس کرتا ہے.....

ہوسکتا ہے عرش الٰہی یہیں نازل ہو..... اس خیال کے بعد منیٰ کی سڑکیں، راستے سب ایک طرف رہ گئے بس ذہن میں عرش الٰہی کا تصور تھا۔

مسجد خیف بھی تو منیٰ میں ہے۔ جہاں ستر انبیاءؑ مدفون ہیں جہاں پر نماز کی ادائیگی قصر ہوتی ہے۔ اس کا مطلب ہے اللہ نے ہر نبی کو یہاں بلا کر اس جگہ سے مانوس کیا۔

آؤ، دیکھو یہ ہے میری منتخب جگہ..... یہاں میرے پیارے بندے ابراہیمؑ نے فرشتوں کو لاجواب کردیا تھا۔

جہاں ابلیس ملعون کے منہ پر طمانچہ پڑا تھا۔ اے شیطانی وسوسوں پر اللہ کو بھولنے والے دنیا کے پیارو..... اسی منیٰ میں تو اس مردود نے تین مرتبہ ورغلایا تھا۔ منیٰ تیری سرزمین پر وہ مردود ناکام ہوا۔ ابراہیمؑ نے اسکو مجسم شکل میں دیکھ کر بھی اس کا کہا نہ مانا،

ابراہیمؑ کامیاب اور ابلیس ناکام ہوا۔ اس دن سے وہ ہر

حاجی سے کنکر کھاتا ہے۔اللہ کی کبریائی کا ہر کنکر مارنے سے قبل بلند آواز میں پرجوش کلمہ تجھے یہاں رسوا کرتا ہے..... پسپا کرتا ہے۔منیٰ.....میری فرط عقیدت سے آواز بھرا گئی۔اللہ تو نے مجھ گناہگار پر کتنا کرم کیا۔میرے ناپاک، گناہ گار قدموں کو اس سرزمین پر بلایا جہاں تیرے بندے نے تجھے چاہا وحدہ لاشریک کہا اور پورا اترا!

اللہ اب بھی اپنے بندوں کو منیٰ میں بلاتا ہے ان پر کرم کرتا ہے۔آج بھی تم جمرات میں شیطان پر ایک کنکر مارو ایک گناہ کبیرہ بخشوالو۔سلام علیٰ ابراہیمؑ!

میرا دل ابراہیمؑ پر سلام بھیج رہا تھا۔اب یہاں دس ذوالحج کو چاروں طرف حاجی قربانی کے جانور ذبح کرتے ہیں۔ قربانی جب تک نہیں ہوگی احرام نہیں کھلے گا۔ایک آخری امتحان جس پر ابراہیمؑ پورا اترے.....جہاں عقل دنگ رہ گئی۔

اور شاید عشق بھی گونگا ہو گیا ہو! جہاں اسماعیلؑ کو آداب فرزندی سکھائے.....

اسکی یاد میں ہر سال لاکھوں قربانیاں اس ''چاہت'' کے جذبے میں اللہ دلواتا ہے۔

اسکے بعد تو محبت، جنوں، جذبہ سب لفظ شرمندہ ہو گئے ہوں گے!

سلامُ علی ابراہیمؑ منیٰ سے بذریعہ ٹرین ہمیں عرفات روانہ ہونا تھا۔حرم میں تو ایک لمحہ کی فراغت نہیں ہوتی یہاں فراغت ہی فراغت ہے چلو امتل (مدیرہ خواتین ڈائجسٹ) سے مل آتے ہیں۔امتل کو فون کر کے ایڈرس معلوم کیا اور اشتیاق صاحب کے ہمراہ چل پڑی۔ سڑکیں بھری ہوئی لوگ کھانے پینے باتوں میں مصروف، گرمئی بازار عروج پر تھی۔دو ایک لوگوں سے امتل کا خیمہ معلوم کیا مگر بڑی عجیب سی بات ہے راہبری کے فرائض سرانجام دینے کو جگہ جگہ انڈین متعین تھے۔یا عربی۔کہیں کوئی پاکستانی نظر نہ آیا اور عرب تو ویسے ہی اس سڑی گرمی میں کچھ بدوانہ اور قریشیوں والا مزاج رکھتے تھے۔ایک پاکستانی نے ہمیں سوق العرب پر ہی واقع امتل کے خیمے کی جگہ سمجھائی۔اللہ اللہ کر کے مطلوبہ مقام تک پہنچے۔استقبالیہ والوں نے اندر جانے سے منع کر دیا۔ گرمی سے ہم کیا ہر بندہ بشر ہی نڈھال تھا۔ویٹنگ روم میں بیٹھ کر میں نے امتل کو فون کیا۔اپنے آنے کی اطلاع دی اتنے میں دائیں طرف نظر پڑی۔قد آدم شوکیسوں میں ٹھنڈی ٹھار دلبہار جوسز کی بوتلیں، منرل واٹر اور بہت کچھ پڑا تھا۔کچھ دیر کے بعد پیاس کی تڑپ سے بے قرار ہو کر میں نے ''احد بارد مویا'' مانگا۔ایک کی بجائے دو ٹھنڈی بوتلیں اور بسکٹ، جوس کھجوروں پانی پر مشتمل دو گفٹ پیک بھی ساتھ ہی.....میرا دل دہل گیا۔ریال اگر زیادہ مانگ لئے تو؟

میں نے اٹک اٹک کر قیمت پوچھی۔بے نیازی سے جواب ملا۔

حجہ! ہدیہ.....ہدیہ۔کہہ کر وہ دوسرے ملاقاتی کو یہ گفٹ پیک دینے میں مصروف ہو گیا۔ٹھنڈا پانی پی کر کچھ ہوش ٹھکانے آئے اتنے میں یہ بھی بڑا سا گفٹ پیک لے کر واپس آئے تھے کہ امتل کا فون آ گیا۔

''قافلہ سکیورٹی کا مسئلہ ہے یہ لوگ مجھے نہیں آنے دے رہے کل کوشش کریں گے۔''

میں کیمپ سے باہر آ گئی۔اب سورج بالکل سر کے اوپر تھا۔منیٰ۔لوگوں سے اٹا پڑا تھا۔میلے کے سی کیفیت .....حجاج

کرام کی ''للّٰہیت'' کہیں کسی میں بظاہر ڈھونڈے سے نہیں مل رہی تھی۔ شاید عرفات میں مل جائے .....خیموں کے شہر سے نکل کر میدان حشر میں!

میں نے اپنے دل کو تسلی دی۔ اپنے کیمپ میں واپس پہنچے تو وہی بے ہنگم باتوں کا شور شرابا..... ہلا گلا۔

معلم کی طرف سے پکا پکایا ''چکن منچورین'' قسم کا ڈبہ پیک گرما گرم کھانا ہمارے ہاتھوں میں تھا۔ سب اس لذیذ چکن کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہے تھے۔ میں بس انہی سوچوں میں مگن تھی کہ ہمارا حج بس لذتوں کی تلاش اور وصولیوں کا نام ہے شاید!

حالانکہ سوچنے والے یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ اللہ اپنے مہمانوں کو اگر دنیوی لذتوں اور چسکوں سے مالا مال کر رہا ہے اے سی سے نواز رہا ہے تو تم کیوں پریشان ہوتی ہو؟

لیکن کیا کروں میں نے بچپن سے ہی ابراہیمؑ کی طرح مشقتوں والے کچے راستوں پر چلنے والے حج کا خواب دیکھا تھا۔ خیر گروپ کی ایک خاتون نے تازہ ترین خبر فراہم کی۔

منیٰ میں بھی البیک موجود ہے! یہ کہہ کر کیمپ کے کافی سارے لوگ اس میں کھانا خریدنے چلے گئے۔ کیمپ میں درجنوں خواتین ابھی بھی موجود تھیں۔ ہر دو چار خواتین میں ان کا محرم اور ہمارا نامحرم بھی موجود تھا۔ لہٰذا دن سارا بیت گیا کمر، بستر پر لگانے کی حسرت ہی رہی۔ سوچا رات کو یہ عیاشی ملے گی جب لائٹس آف ہوں گی اور یہ مرد اپنے بستروں پر چلے جائیں گے۔

لیکن.....ارے یہ تو اعلان ہو گیا کہ معلم صاحب کا حکم ہے آج بعد از نماز مغرب میدان عرفات روانہ ہونا ہے۔ بذریعہ ٹرین۔ اور جسے آج نہیں روانہ ہونا وہ کل جانا چاہتا ہے وہ اپنی رخصتی کا خود انتظام کرے۔

لو جی! تھکے ہوئے وجود پر مزید تھکن سوار ہو گئی۔ جس جس کا ٹرین کا ٹکٹ (بازو میں ڈالنے والا جسے ایک دفعہ پہن لیا تو سوائے کاٹنے کے کوئی اور صورت نہیں تھی) نہیں تھا وہ رشک سے ہمیں دیکھتا۔

''ارے تم عرفات ٹرین پر جاؤ گی۔؟ مغرب کی نماز کے فوراً بعد سوق العرب پر ہماری لائنیں بنیں۔ کیمپ چالیس کے تمام مرد خواتین اس گروپ میں تھے جسے ٹرین پر سفر کے لئے ابھی ریلوے اسٹیشن پہنچنا تھا۔

جوں کی چال آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہمارا سینکڑوں حاجیوں کا گروپ ڈیڑھ گھنٹے میں اسٹیشن پہنچا۔ اور یہ اتنا تھکا دینے والا مرحلہ تھا کہ جو پہلے حج کر چکے تھے وہ بار بار کہہ رہے تھے کہ اتنا چل کر تو عرفات کا میدان ویسے ہی آ جاتا ہے۔

ایسے ہی اوپر نیچے کئی طرح کی سیڑھیاں چڑھنے اترنے کے بعد بالآخر اسٹیشن کی حدود میں داخل ہو گئے۔ صاف شفاف اسٹیشن لیکن نہ کوئی کرسی نہ کوئی صوفہ نہ بیٹھنے کا سامان کیمپ سے چلے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ کھڑے کھڑے ٹانگیں شل ہو گئی تھیں۔ ہمارا اسٹیشن ''منیٰ ٹو'' تھا بالآخر ہماری ٹرین آ گئی۔

سیکنڈوں کے حساب سے رکتی اور چل پڑتی۔ بس جہاں آپ کھڑے ہیں سمجھئے ٹرین آئی تو دروازہ کھلنے کی دیر ہے۔ اپنے آپ ٹرین میں ہی سوار سمجھئے۔ شاندار، برق رفتار، اے سی کی زبردست ٹھنڈک لئے ٹرین نے ہمیں سوار کیا ہی تھا کہ عرفات آ گیا۔

وقوفِ عرفات.....حج کا لازمی رکن!

☆☆☆

کوثر مسعود

# میری آپی

الخدمت کراچی ضلع جنوبی کی انچارج فریدہ مقبول مرحومہ کی یاد میں ان کی بہن کے احساسات

دلِ غافل نہ ہو یکدم یہ دنیا چھوڑ جانا ہے

یاددہانی کے یہ الفاظ میں نے اپنی پیاری آپی کی ڈائری کے صفحات پلٹتے ہوئے پڑھے۔ میرے دل کی دنیا عجیب ہوگئی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ الفاظ انھوں نے لکھے تھے اور خود دنیا چھوڑ کر جا چکی تھیں۔

اللہ نے انھیں نوازا تھا ہر طرح کی آسائش عطا کی تھی اور وہ اس میں سے اللہ کا حصہ نکالتی تھیں۔ اپنا وقت، اپنی صلاحیتیں، مال سب کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرتی تھیں۔ پروگرامات کے انتظامات، الخدمت کی ذمہ داری، مدرسہ کی ذمہ داری، گاڑیوں کو شیڈول کے مطابق افراد کے پاس بھیجنا اور دیگر کئی کام سب کچھ اس طرح کرتی تھیں کہ کسی کو محسوس نہ ہونے دیتیں کہ وہ کس طرح اتنے کام خاموشی سے کر لیتی ہیں۔ ہمیشہ مسکرا کر ملنا، ایثار کرنا ان کا طریقہ تھا، یعنی عمارت کی ان اینٹوں میں سے تھیں جو زیرِ زمین ہوتی ہیں مگر جن کی وجہ سے عمارت مضبوط ہو جاتی ہے۔

ہمارے لیے گھنا سایہ تھیں کوئی مسئلہ ہو آپی سے کہہ دینا ہی کافی ہوتا تھا۔ کوئی مشورہ لینا ہو۔ شعبے کے لیے مالی مدد لینی ہو بڑے اطمینان سے فون کرتے اور کام ہو جاتا۔

آپی کی عنایتیں ملتی تھیں اور میں اسے اپنا حق سمجھ کر لیتی تھی۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ نعمت چھن بھی سکتی ہے۔

اکثر اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے اچار، چٹنی بھیجتی تھیں، پورے دن کے اجتماع میں کبھی کھانا ہمراہ لے جانے کے بارے میں نہیں سوچتی تھی کیونکہ اطمینان ہوتا کہ آپی تو ہوں گی نا! وہ میرے حصے کا بھی لے کر آتی تھیں۔ مجھے تلاش کر پہنچتیں، دسترخوان پر بٹھاتیں۔ ان کے انتقال سے پہلے جو آخری اجتماع ارکان کراچی کی سطح کا ہوا اس میں وہ مجھے نہیں ملیں۔ مجھے یکا یک خیال آیا کہ آپی ابھی تک میرے پاس نہیں آئیں۔ میں نے فون کیا آپی آپ نے کھانا کھا لیا؟ کہنے لگیں ہاں میں نے کہا۔ آپ کہاں ہیں؟ بتایا میں گھر پر ہوں ڈاکٹر نے ریسٹ بتایا ہے۔ خود سے کبھی بیماری کا تذکرہ بھی نہیں کرتی تھیں۔ اس ریسٹ کے دوران بھی گھر کے جملہ امور نجام دیتی رہیں، انٹر کام اور فون اٹھانے اور دروازہ کھولنے کے لیے جانے پر میں نے کہا کہ آپ کو ڈاکٹر نے ریسٹ بتایا ہے تو خفگی سے کہنے لگیں کہ کیا بالکل بستر پر بیٹھی رہوں۔ کہا کم از کم آرام دہ پوزیشن میں تو بیٹھیں ٹیک لگا لیں۔ کہتیں ٹھیک بیٹھی ہوں۔ بعد میں بیٹی نے بتایا کہ کمر میں اتنا درد تھا کہ کسی طرح آرام نہیں مل رہا تھا۔ میں نے کہا کہ ہم اتنی دیر ساتھ بیٹھے انھوں نے ذکر تک نہ کیا کہ کہیں تکلیف ہے۔

آپریشن کی تاریخ ملنے کے بعد اجتماع ناظمات میں جا کر

سارے حسابات کیے۔ الخدمت کی ذمہ داری کے تحت جو امدادی رقوم دینی تھیں وہ دیں کسی پر اظہار نہ کیا کہ بیمار ہیں۔ انتقال پر آنے والی بہنیں یہ کہہ رہی تھیں کہ ہمیں تو پتہ ہی نہیں تھا بیماری کا، ابھی چند دن پہلے تو ہم ملے تھے۔ کچھ تو یہی گمان کر رہی تھیں کہ خبر غلط ہے۔

آپی کا لقب انھیں گھر کے علاوہ تحریکی بہنوں نے بھی دے رکھا تھا۔ تمام کارکنان فریدہ آپی کہتی تھیں اور وہ سب کی آپی ہی تھیں، ان کا تعلق سب سے بڑی بہن کا سا ہی تھا۔ کبھی کہتیں مجھے تو ڈرائیورز بھی آپی کہتے ہیں۔

بیرونِ شہر سے آنے والی بہنوں کو ٹھیرانے کی ضرورت پیش آتی تو میں ان سے پوچھے بغیر ہی ان کے گھر ٹھیرانے کی حامی بھر لیتی اور پھر ان کو اطلاع دیتی کہ اتنے مہمان آئیں گے اتنے دن ٹھہریں گے وہ خوشدلی سے سن کر انتظامات کر دیتیں۔

ان کی نمایاں خوبیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ کبھی شکوہ شکایت نہیں کرتی تھیں۔ بہنوئی کے انتقال کے بعد یہ فکر تھی کہ آپی کیسے اپنے آپ کو سنبھالیں گی، کیونکہ بہنوئی بہت خیال رکھنے والے تھے آپی کے سارے کام وہی کرواتے تھے۔ شاپنگ ہو، ڈاکٹر کے پاس جانا ہو، کبھی آپی تنہا نہیں جاتی تھیں مگر ان کے بعد آپی نے کبھی شکوہ نہیں کیا نہ اپنی تنہائی کا نہ اور کسی بات کا۔ انھوں نے دین کے کام میں اپنے کو مصروف کر لیا۔

دوسروں کے ساتھ درگزر کا معاملہ کرتی تھیں جو ماسی ان کے پاس تھی اس کا بہت خیال رکھتی تھیں جب بھی اس کا ذکر کرتیں تعریفی الفاظ ضرور کہتی تھیں۔ ان کے بعد ماسی کہنے لگیں کہ میں گیارہ سال باجی کے پاس رہی باجی نے مجھے کبھی جھڑکی نہیں دی۔ مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ یاد آ گیا کہ حضرت انسؓ کہتے تھے کہ میں دس سال حضورؐ کی خدمت میں رہا اور انھوں نے مجھے کبھی یہ نہ کہا کہ تم نے یہ کام کیوں نہ کیا۔

اسی طرح ڈرائیورز کے ساتھ معاملہ تھا ضلع کی گاڑیوں کو شیڈول کے مطابق بھیجنے کی ذمہ داری تھی۔ ڈرائیورز ڈیوٹی کے لیے ان ہی کو فون کرتے۔ دن بھر میں بے شمار فون اس کام کے لیے ہو جاتے مگر خندہ پیشانی سے نبھاتیں۔ ایک ڈرائیور کہنے لگے باجی ان کے بعد تو ہم یتیم ہو گئے۔ میری بچی ان ہی کی وجہ سے تعلیم حاصل کر رہی ہے انھوں نے ہی اسے داخل کروایا تھا اب وہ نویں جماعت میں ہے۔

الخدمت کے شعبے کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ملاقاتیں اور فنڈنگ کرتیں۔ قرض حسنہ کی درخواستیں آتیں ان کے لیے علیحدہ انتظام کرتیں۔ ایک علیحدہ فنڈ بنایا ہوا تھا جو صرف قرضِ حسنہ دینے میں استعمال ہوتا تھا۔ تمام حسابات کا ریکارڈ بہترین طریقے سے درج کرتیں۔ اسپتال جانے سے پہلے سارا ریکارڈ درست کر کے اپنی نائب کے حوالے کر کے گئیں۔

بزرگ تحریکی ساتھیوں کو پروگرامات میں یا دیگر کسی ملاقات وغیرہ کے لیے لے کر جانا، رسائل تقسیم کروانا یہ سب اپنی ذمہ داری بنا رکھا تھا۔ وہ تحریکی بہنیں آنسوؤں کے ساتھ کہتی ہیں کہ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ کس سے کہیں وہ تو خود فون کر کے پوچھتی تھیں آپ نے چلنا ہے؟

یہ ساری نیکیاں گواہیاں انشاءاللہ بارگاہِ الٰہی میں قبول ہوں گی اور رب ان کو بڑھا چڑھا کر اجر عطا فرمائے گا۔

☆☆☆

آسیہ راشد

# خشک میوہ جات

## موسمِ سرما میں ہماری صحت کے محافظ

سردی کے موسم کا ایک اپنا لطف ہے۔ قدرت نے ہر موسم کے ساتھ ہمیں کھانے پینے کیلئے انواع واقسام کے پھلوں اور سبزیوں سے نوازا ہے جو موسم کے مطابق ہماری صحت کی حفاظت میں ہمارا بھرپور ساتھ دیتے ہیں۔ موسم سرما کا خصوصی تحفہ خشک میوہ جات ہیں جو اپنے اندر بے شمار فوائد لئے ہوئے ہیں۔ سردیوں کے موسم میں ہیٹر کے پاس بیٹھ کر جہاں اس موسم کا مزا خشک میوہ جات سے دوبالا کیا جاتا ہے وہیں ہم اپنے جسم میں پلنے والی بیماریوں کو بھی دور بھگا رہے ہوتے ہیں۔ آیئے ان میووں کے فوائد کا جائزہ لیتے ہیں۔

انجیر:

انجیر جنت کا میوہ ہے اس کا ذکر قرآن پاک میں بھی آیا ہے۔ اس کی تاثیر گرم ہوتی ہے۔ سفید انجیر حلق کی سوزش، سینے کے بوجھ اور پھیپھڑوں کی سوجن میں مفید ہے۔ جن کے سینے میں بلغم ہو وہ اسے استعمال کریں کیونکہ انجیر بلغم کو پتلا کر کے خارج کرتا ہے۔ نہار منہ انجیر کھانے سے بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں یہ دل کے عارضے سے بچاتا ہے۔ کولیسٹرول کم کرتا ہے۔ شوگر کے مریضوں کیلئے مفید ہے۔ ہائی بلڈ پریشر کو کنٹرول کرتا ہے۔

اخروٹ:

دماغی کمزوری میں بہت مفید ہے۔ گرم مزاج والوں کے لئے نقصان دہ ہے۔ زیادہ استعمال سے منہ میں دانے بھی نکل آتے ہیں۔ اس میں ایسے اجزاء ہوتے ہیں جن سے نیند بہت اچھی آتی ہے۔ دل کی رفتار کو اعتدال میں رکھتا ہے۔ کینسر کے مرض میں بھی مفید ہے۔ کالے اخروٹ ہائی بلڈ پریشر، دل کی جلن اور بہت سی جلدی بیماریوں کی روک تھام میں مدد کرتے ہیں۔

بادام:

دماغ، بصارت اور جسم کی تقویت کیلئے اس کا استعمال نہایت مفید ہے۔ دل کی کمزوری کیلئے موسم گرما میں اسکی سردائی بنا کر پینا نہایت مفید ہے۔ بادام کی سات یا گیارہ گریاں کھانی چاہئیں اس سے زیادہ کھانی نقصان دہ ہیں۔ یہ کولیسٹرول بڑھاتے ہیں۔ بادام کا حلوہ نزلہ، زکام، سردرد کیلئے مفید ہے۔ بادام میں آئرن بہت زیادہ مقدار میں ہوتا ہے جو جسمانی خلیوں کو توڑ پھوڑ سے بچاتا ہے۔ بادام کا پیسٹ، بالائی اور عرق گلاب کو ملا کر چہرے پر لگانے سے رنگ گورا اور جلد چمکدار ہو جاتی ہے۔ بادام کا تیل سردرد دور کرنے کے علاوہ بالوں کو گرنے سے روکتا ہے۔ قبض دور کرنے کے علاوہ جلدی امراض میں بھی بہت مفید ہے۔

پستہ:

یہ دل کیلئے بہت مفید ہے کولیسٹرول کو کم کرتا ہے۔ بدن کو فربہ کرتا ہے۔ دماغی کمزوری میں بھی مفید ہے۔ آنکھوں کیلئے فائدہ مند ہے۔ ذیابیطس کے مریضوں کو فائدہ پہنچاتا ہے اور بلڈ شوگر کو بھی کنٹرول کرتا ہے۔ قبض کشا بھی ہے۔ گرم مزاج

والے اسے استعمال نہ کریں۔

کھجور:

کھجور میں بہت زیادہ (کیلوریز) حرارے پائے جاتے ہیں۔ایک کھجور میں 20 حرارے ہوتے ہیں جو ایک چائے کی چمچی چینی کے برابر ہے۔ اس سے وزن بڑھتا ہے۔قبض دور کرنے کیلئے گٹھلی نکال کر کھجوروں کو ساری رات پانی میں بھگوئے رکھیں صبح اسے گرائنڈر میں شیک کر کے پی لیں۔

کشمش:

اسکی تاثیر گرم بھی ہے اور تر بھی۔دل کی کمزوری میں مفید ہے۔دماغ کے کل اعضاء کو تقویت دیتی ہے۔قبض کشا ہے۔ بلغم دور کرتی ہے۔جن کے جگر اور معدے میں گرمی ہو وہ کم استعمال کریں۔خشک کھانسی کا بہترین علاج ہے۔رات سونے سے پہلے 41 دانے کشمش، 7 عدد بادام بسم اللہ شریف اور درود شریف پڑھ کر کھا لیں انشاء اللہ شفا ہوگی۔ ہر روز نو یا گیارہ دانے کشمش کھانے سے دماغی قوت بڑھتی ہے۔

مونگ پھلی:

چنبل اور جلد کے تمام امراض کیلئے مونگ پھلی کے تیل کی مالش مفید ہے۔اسکے زیادہ استعمال سے کھانسی لگ سکتی ہے۔کھاتے ہوئے اس کا لال رنگ کا چھلکا اتار لیں یہ دیر سے ہضم ہوتا ہے۔مونگ پھلی میں پایا جانے والا وٹامن ای کینسر کے خلاف لڑنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ ذیابطیس کے مریضوں کے لئے مونگ پھلی کا استعمال نہایت مفید ہے۔اس میں تیل کی کافی مقدار ہونے کے باوجود وزن نہیں بڑھتا۔ مونگ پھلی کے بعد ایک یا دو گھونٹ دودھ پی لیں تو کھانسی نہیں لگتی۔

چلغوزے:

دل کے ساتھ جسمانی پٹھوں کو تقویت دیتا ہے، گردوں اور جگر کی بیماری میں مفید ہے۔ بلڈ پریشر کے مریضوں کے لئے مفید ہے۔فالج کے اثر سے محفوظ رکھتا ہے۔چلغوزے شہد کے ساتھ کھانا کھانسی کیلئے مفید ہے کمزور لوگ دودھ کے ساتھ کھائیں تو موٹے ہو سکتے ہیں۔کچا چلغوزہ نہیں کھانا چاہیے یہ دیر سے ہضم ہوتا ہے۔اس سے بھوک بھی بند ہو جاتی ہے۔

ناریل:

خون پیدا کرتا ہے۔ فالج کے مریض کیلئے فائدہ مند ہے۔اس میں چکنائی زیادہ ہوتی ہے اس لئے اس کا کم استعمال مناسب ہے۔ ناریل کا پانی گردے کی پتھری میں آرام دیتا ہے۔ پکے کی بجائے کچا ناریل زیادہ مفید ہے۔ناریل کا تیل دماغی کمزوری اور بالوں کی نشوونما کیلئے مفید ہے۔ بالوں میں لگانے سے سکری دور ہوتی ہے۔

نوٹ: ہر چیز کو کا اعتدال کے ساتھ کھائیں۔زیادتی سے بہت زیادہ نقصان کا احتمال ہے۔

کھانسی، نزلہ وزکام کا آسان گھریلو علاج

☆ ادرک کی چائے: کھانسی، نزلہ وزکام کی صورت میں ادرک انتہائی مفید ثابت ہوتا ہے۔اس کے لئے ایک کپ پانی تازہ ادرک کا چھوٹا ٹکڑا ڈال کر ابال لیں پھر اس میں ایک چائے کا چمچہ شہد ملا دیں اور گرم گرم پئیں۔ چائے کی پتی ڈالنے سے قبل ادرک کے چار ٹکڑے کچل کر پانی میں ڈال دیں اور چائے بنا کر پی لیں۔

☆ کالی کھانسی اور ہوا کی نالی میں تنگی کیلئے، دو کپ پانی میں پسی ہوئی ادرک دو چمچ، ابالنے کیلئے رکھ دیں ہر دو گھنٹے کے

بعد گرم گرم استعمال کریں۔ دودھ میں ہلدی، تھوڑا سا ادرک کا رس اور چٹکی بھر کالی مرچ ملا کر پی لیں۔

☆ ایک کپ گرم پانی میں دو سے تین کھانے کے چمچ، سیب کا سرکہ اور حسبِ ضرورت شہد ملا کر پئیں۔

☆ وٹامن سی، دھوپ اور تیز پیاز کی خوشبو، نزلہ وزکام کا بہترین علاج ہے۔ روزانہ ایک ہزار ملی گرام وٹامن سی استعمال کرنے سے نزلہ وزکام میں افاقہ رہتا ہے۔

☆ ایک بڑی پیاز کاٹ کر اردگرد رکھ لیں اور روزانہ دھوپ میں بیٹھیں، ہلدی سردی یا زکام سے محفوظ رکھتی ہے مگر زکام کا آرام آجانے کے بعد اس کا مسلسل استعمال مفید نہیں۔

☆ مرغی کا شوربہ یا سوپ نزلہ وزکام کیلئے مفید ہوتا ہے اس سے ناک اور گلے کی سوزش میں فائدہ ہوتا ہے۔ نمک ملے پانی سے روزانہ صبح وشام غرارے کرنے سے حلق کی سوزش کو آرام ملتا ہے۔

☆ چار کپ پانی میں دو تین درمیانے ٹکڑے دار چینی کے ڈال کر پکائیں جب پانی آدھا رہ جائے تو نیم گرم پی لیں۔ کھانسی اور زکام کا بہترین علاج ہے۔

آسیہ راشد

# احتیاط کریں

## بچوں کو سردی کے مضر اثرات سے بچائیں

بچے اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہیں۔ نبی کریمؐ نے انہیں جنت کے پھول کہا ہے۔ جس طرح ایک پھول نرم ونازک ہوتا ہے اور اس کی بے انتہا حفاظت کی جاتی ہے اسی طرح بچے کی صحت کی حفاظت ماں کی ذمہ داری ہے۔ ہر ماں ممکنہ حد تک اپنے بچے کو صحت مند دیکھنا چاہتی ہے خصوصاً سردی کے موسم میں تو اس کی پریشانی دیدنی ہوتی ہے۔ اگرچہ سردی کا موسم بہت پرلطف ہوتا ہے مگر چھوٹے بچوں کی ماؤں کیلئے بالکل بھی نہیں۔ خاص طور پر نوزائیدہ بچوں کیلئے فکر مند ہونا ضروری ہوتا ہے۔ کہتے ہیں نوزائیدہ بچوں کی پہلی سردیاں اور پہلی گرمیاں بہت مشکل ہوتی ہیں اس لئے سبھی مائیں اپنے بچوں کو سردی وگرمی کے مضر اثرات سے بچانے کی کوشش میں رہتی ہیں۔ آج کل سردی کا موسم اپنے جوبن پر ہے اور نزلہ وزکام، بخار عام طور پر بچوں کو اپنی پکڑ میں لے لیتا ہے۔

**بچوں کو ٹھنڈ لگ جانا:** یہ بہت ہی خطرناک ہوتا ہے اس سے بچوں میں بخار، گلاخراب اور سینے کے امراض خصوصاً نمونیے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے اور نمونیہ کافی مہلک مرض ہے۔ آج کل پولیو کے قطروں کے ساتھ نمونیے سے بچاؤ کے ٹیکے بھی لگائے جاتے ہیں لیکن پھر بھی احتیاط ضروری ہے۔

**ٹھنڈ لگنے کی وجوہات کیا ہیں؟** سب سے بڑی وجہ بچوں کا گیلا رہنا ہے۔ مناسب کپڑے نہ پہنانے کی وجہ سے ٹھنڈ لگ جاتی ہے یعنی اگر کم گرم کپڑے ہیں تو ٹھنڈ لگنے کے امکانات زیادہ ہیں۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ بچوں کو مکمل طور پر ڈھانپ کر رکھیں خصوصاً سخت سردی میں۔ سر گردن، سینہ اور پاؤں مکمل طور پر گرم کپڑوں میں لپٹے ہوں۔ مائیں عام طور پر سوئیٹر اور پاجامہ پہنا کر سمجھتی ہیں کہ ہم نے بچوں کو گرم کپڑے پہنائے ہوئے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ جو بچہ گود میں ہے اسے گرم کمبل یا شال میں لپیٹ کر کمرے سے باہر نکالیں خصوصاً رات کو ٹھنڈ زیادہ ہوتی ہے اس لئے رات کو زیادہ احتیاط کرنی چاہیے۔ بچے کو کھلی کھڑکی یا دروازے کے قریب مت لٹائیں جہاں سے ہوا سیدھی اندر آتی ہے اس سے بھی ٹھنڈ لگ سکتی ہے۔

**بچوں کو نہلانا:** سردی کے موسم میں بچوں کو بہت احتیاط سے نہلانا چاہیے۔ جس جگہ پر بچے کو نہلائیں وہاں ہیٹر یا انگیٹھی سلگا کر کمرہ یا غسل خانہ گرم کرلیں۔ پانی نیم گرم کریں اور اسے اپنے ہاتھ یا بازو پر ڈال کر چیک کرلیں کہ زیادہ گرم یا ٹھنڈا نہ ہو۔ نہلانے کے بعد کپڑے بھی اسی گرم کمرے میں پہنائیں اور اچھی طرح ڈھانپ کر بچے کو باہر لائیں۔

بچوں کو دھوپ میں بٹھائیں اس سے انکی نشوونما پر اچھا اثر پڑے گا۔ اور وٹامن ڈی بھی حاصل ہوگی۔

ماں کا دودھ بچے کا بنیادی حق ہے اور صحت بخش غذا ہے بچے کو اس حق سے محروم نہ کریں۔ سردی کے موسم میں ماں کا دودھ پینے والے بچے اور ماں دونوں آرام سے رہتے

ہیں۔

**نزلہ وزکام، بخار:** اگر بچے کسی بے احتیاطی کی وجہ سے بیمار ہو جائیں تو پریشان مت ہوں۔ ایک ماں کو بہت حوصلہ مند ہونا چاہیے اور اپنی پوری توجہ بچے پر دینی چاہیے۔

سردی کے موسم میں اگر ناک بند ہے تو بچوں کو دو تین دفعہ سادے پانی سے بھاپ دیں اس سے انکی ناک بند نہیں ہوگی اور وہ سکون سے سوئیں گے۔

کھانسی لگنے کی صورت میں تھوڑے سے گرم پانی میں شہد ملا کر پلائیں۔

اگر بچے کو تیز تیز سانس آ رہا ہو یا اسکی پسلیاں تیز تیز چلنے لگیں یا سانس لینے میں مشکل پیش آ رہی ہو تو اسے فوراً بچوں کے ڈاکٹر کو دکھائیں، یہ نمونیے کی علامت ہے۔

اگر گھر میں کسی بچے کو دمہ کی تکلیف ہو تو اس کے قریب جھاڑو نہ دیں کیونکہ مٹی اڑنے سے سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے۔ بچے کو کھانا کھلانے سے پہلے اپنے ہاتھ اچھی طرح دھولیں۔ بچے کو اگر فیڈر میں دودھ پلا رہے ہیں تو ہر دفعہ فیڈر کو گرم پانی سے ابالیں، دودھ کو گرم کر کے ٹھنڈا کریں اور پھر بچے کو پلائیں۔

چھ ماہ اور اگر اوپر کے بچوں کو اس سے موشن لگ جائیں تو انہیں کیلا، کھچڑی اور دہی کھلائیں۔ زیادہ موشن آنے کی صورت میں نمکول والا پانی پلائیں، قے کی صورت میں ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کریں۔

بچوں کو پانی میں کھیلنے کا بہت شوق ہوتا ہے اکثر ماؤں کی نظر بچا کر وہ پانی میں کھیلتے پائے جاتے ہیں۔ اگر بچوں کے بازو کے کف، پاجامہ یا موزے ایک آدھ گھنٹہ بھی گیلے رہ جائیں تو بخار ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ جب بھی دیکھیں بچوں نے کپڑے گیلے کر لئے ہیں فوراً کپڑے تبدیل کروائیں۔ ذرا سی بھی بے احتیاطی نقصان دہ ہو سکتی ہے۔

گود والا بچہ اگر رو رہا ہو تو اس کی تین وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ماں کے لئے یہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں کہ بچہ کیوں رو رہا ہے۔ پہلی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس کا پیٹ گیلا ہے اگر نہیں تو وہ بھوکا ہے یا پھر اس نے دودھ پینے کے بعد ڈکار نہیں لیا۔ اگر تینوں میں سے کوئی وجہ نہیں ہے تو بچہ تکلیف میں ہے اسے ڈاکٹر کو دکھائیں۔

☆☆☆

# محشرِ خیال

عنایت علی خان۔حیدرآباد

جون کے شمارے میں شیما ہمایوں کی تحریر نظر سے گزری تھی آج پھر سامنے آئی تو خیال آیا کہ برادر محترم مسلم سجاد صاحب کی تجویز کی تائید میں آپ بیتی لکھنے کی فرمائش کروں۔ عزیزہ کو مشرقی پاکستان میں وہاں کے مقامی خاندان میں رہتے ہوئے جو قدرتِ تحریر حاصل ہے وہ قابلِ رشک ہے بڑی سادہ اور رواں زبان میں واقعات تحریر کیے ہیں۔حمد ونعت اور ایک غزل برائے اشاعت منسلک کررہاہوں۔پسند ہوتو شامل کرلیجیے گا۔

☆☆☆

شاہدہ اکرام۔ملتان

بتول میری زندگی میں
(حاصل، ماحصل)

''بتول'' میرے نکاح میں آیا تھا۔ہے نا عجیب بات؟ لیکن یہ سچ ہے۔میرا تو بتول سے تعارف شادی کے بعد ہی ہوا تھا۔۱۹۷۰ء کی بات ہے۔۴۲ سال کا عرصہ کوئی کم تو نہیں۔گولڈن جوبلی ہونے میں صرف ۸ سال باقی ہیں ان شاءاللہ۔

رسالوں، کتابوں کی شوقین کے لیے یہ ایک نعمت سے کم نہ تھا۔میٹرک تک میں ہر طرح کے ادبی، سیاسی، دینی، اخلاقی، معاشرتی، بلکہ اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو فلمی رسالے تک بہت غور وفکر سے پڑھتی تھی۔فلمی سے آپ چونکئے مت۔دراصل مجھے ڈرائنگ کرنے کا بہت شوق تھا۔مشکل سے مشکل چیزوں کو اصل کی طرح بنالینا میرا مشغلہ تھا تو فلمی رسالہ ''رابطہ'' سے میں، مختلف پوز میں کھنچی ہوئی صنف نازک کی تصاویر کے ماڈل بناتی اور اپنے سب سے خفیہ صندوق میں رکھتی۔اماں، ابا کی کڑی نگرانی اور ڈانٹ سے بھی تو کسی طرح بچنا تھا نا! یہ شوق زیادہ دیر نہ چل سکا اور اپنی موت آپ ہی مرگیا اور اس کی جگہ ''حور'' اور ''زیب النساء'' جیسے معیاری ادبی رسائل نے لے لی۔

اماں، ابا کی نگرانی سے نکل کر علم کے حصول کے لیے جو سفر کیے اس میں مزید خصوصیات کے حامل سرپرستوں سے واسطہ پڑا جنھوں نے ادبی چاٹ کو مہمیز لگائی اور چاشنی عطا کی۔ جس کی بدولت'' فن'' ''فنون''''چٹان''اور''خدام الدین'' جیسے ماہناموں اور ہفت روزوں سے تعلق خاطر بنا اور یوں دینی، سیاسی، اخلاقی اور اصلاحی ادب سے واقف ہوتی گئی۔

بات تو بتول کی ہورہی تھی۔ابتدا میں اُن رسالوں کی جدائی شاق گزری مگر آہستہ آہستہ ''بتول'' نے اپنا رنگ جمانا شروع کردیا۔۸۰ کی دہائی میں تو یہ دل ودماغ پر راج کرنے لگا۔

بتول نے میری سوچ کو بدلا، عمل میں تبدیلی آئی اور

ایک مشن کے تحت اس کو عام کرنے کا بیڑہ اٹھالیا۔ وہ دن اور آج کا دن میرا اور ''بتول'' کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ کے لیے اس میں رہنمائی موجود ہے۔ اس کا ہر لفظ بولتا محسوس ہوتا ہے۔ یہ ادارہ اور انتظامیہ کی خون پسینہ کی کمائی ہے۔ جب جب اور جس جس نے اس کی آبیاری کی ہے اس نے ہی اسے جگر کا خون دے کر پالا ہے۔ وہ ادوار ہوں یا اسلاف، باہمی نسبت تناسب ضروری ہے۔

کل کا بتول بھی اپنے اندر ایک تاریخ رکھتا ہے اور آج کا بتول بھی ادارہ کی محنت شاقہ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ اخلاص سے کی گئی کوششوں کو ضرور بارآور کرتا ہے الحمدللہ۔

مجھ پر ''بتول'' کا بہت سا قرض ہے جس کو مجھے اتارنا ہے۔ اکابرین کی تحریک وترغیب، یاددہانی اور محنت کا بدل ادا کرنا ہے میں ان کی امیدوں پر پورا نہیں اتر سکتی۔ کاش! سب مجھے معاف کردیں۔

زندگی میں بہت سارے موڑ ایسے آئے کہ قلم کو بالکل زنگ لگ گیا، جیسے سب کچھ منجمد ہوگیا ہو۔ ساتھیوں کی تحریک جاری رہی جس میں خاص طور پر محترمہ ثریا سماء صاحبہ اور محترمہ فرزانہ چیمہ صاحبہ شامل ہیں رب سے عہد و پیمان کی تجدید کی ہے۔ وعدہ تو وفا کرنا ہے نا، چاہے وہ بندوں سے ہو یا خالق کائنات سے۔

نومبر ۲۰۱۲ء کا بتول میرے سامنے ہے۔ اس کو میں نے ایک ہی نشست میں مکمل پڑھا۔ دل سے بے ساختہ دعا نکلی خدایا ان تمام کوششوں کو شرفِ قبولیت عطا فرما، کیا بہترین شمارہ ہے!

اداریہ جاندار ہے۔ ادب، سیاست اور حالاتِ حاضرہ کا احاطہ کرتا ہوا۔ مدیرہ کی فہم وفراست کا ثبوت دیتا ہے۔ سیاسی رنگ کا غلبہ ہے۔ ہر موضوع پر مشتمل پیراگراف کچھ طوالت کا شکار ہوگئے ہیں۔ مجموعی طور پر اثرانگیز ہے۔

''انوارِ ربانی'' میں ڈاکٹر مقبول احمد شاہد صاحب نے دعا کے موضوع پر قلم اٹھایا ہے، ایک ایسے موضوع کو جو پہلے متعدد بار لکھا جا چکا ہے انھوں نے بہت آسان اور عملی طریقے سے بیان کیا ہے۔ ادارہ تینوں اقساط کو پمفلٹ کی صورت میں چھپوا کر سٹالز پر رکھوائے۔ ان شاءاللہ افادہ عام کے لیے بہتر رہے گا۔ مایوس انسانوں کے لیے دعا امید کی ایک روشن کرن کا کام دے گی۔

ڈاکٹر فضل عظیم صاحب کا ''قولِ نبیؐ'' کے تحت ''اللہ کی راہ میں خرچ'' انفاق پر ابھارنے کے لیے بہت محرک رہا۔ اوامر کی ترغیب اور نواہی سے پرہیز کے لیے یہ نسخہ کیمیا ہے۔ اللہ اُن کو جزائے خیر عطا فرمائے آمین۔ ادارہ ایسے مضامین کو چھپوانے کا اہتمام کرے۔ (☆ یہ دونوں مضامین پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوگئے ہیں)

خاص مضمون ''تدریس قرآن مجید کے تقاضے'' ڈاکٹر آسیہ شیر منصوری صاحبہ کا لکھا ہوا ہے۔ بہت چشم کشا ہے، لمحہ فکریہ ہے، تحقیقی اور علمی ہے۔ ہمیں بہت کچھ سوچنے اور سیکھنے پر مجبور کررہا ہے اور یہ کلیدی ضرورت ہے۔ علوم القرآن کے بارے میں جن احتیاطوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ ہر مدرسہ کو معلوم ہونی چاہئیں بلکہ ''بتول'' کی وساطت سے، میں دعوت دین کا کام کرنے والی ذمہ دار بہنوں سے یہ درخواست کروں گی کہ وہ ناظمات، ارکان اور اراکین شوریٰ کے نصاب میں مولانا گوہر رحمٰن مرحوم کی ''علوم القرآن'' لازم کردیں جس کا ذکر موصوفہ

نے کیا ہے۔ اللہ ہماری غلطیوں کو معاف فرمائے اور ہماری صحیح رہنمائی کرے آمین۔

حصہ نظم بھی کیا خوب ہے! پروفیسر اسرار احمد سہاوری کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کی نعت کا ہر شعر رگ و پے میں سرایت کرتا محسوس ہوتا ہے اور ایک راہِ عمل متعین کرتا ہے۔ خاص طور پر یہ اشعار حب رسولؐ اور اطاعت رسولؐ کو مہمیز لگاتے ہیں۔

مری ہر سانس میں نکہت ہے اُنؐ کی
رگِ جاں میں بھری چاہت ہے اُنؐ کی

اور

جھکائے سر کھڑی ہے کج کلاہی
عجوبہ وقت کا شوکت ہے اُنؐ کی

حبِ رسولؐ عملی ثبوت تو پیش کر کے رہے گی۔ آخری شعر زندگی بخش جذبوں کی بیداری کی راہ دکھا رہا ہے۔

نصر اللہ خان عزیزؔ کی غزل بھی خاصے کی چیز ہے۔ قانتہ عبداللہ نے خوب انتخاب کیا ہے۔ کیا حسین مصرع ہے۔

یوں علاجِ خاطرِ ناشاد کر لیتا ہوں میں

اور

بڑھ نہ جائیں حد سے تا سیلابِ عشرت کی حدود
آپ کی دو اِک جفائیں یاد کر لیتا ہوں میں

خود اپنے، آپ ہی چارہ گر بن گئے ہیں۔ اور آخری دو اشعار بھی بہت گہرا معنی رکھتے ہیں۔ ''رنجِ سکونِ زندگی'' میں کیا نسبت لگائی ہے اور پھر فرمایا

رونما اصلاح میں اِفساد کر لیتا ہوں میں

حد درجہ سکون بھی تو موت کی علامت ہے۔ زندگی کی طرف آنے اور ہلچل پیدا کرنے کے لیے افساد کا کیا خوبصورت اشارہ کیا ہے۔

شہود ہاشمی کی غزل چھوٹی بحر میں ہے الفاظ کا چناؤ اور استعمال بہت خوبصورت ہے۔ ہر شعر اپنے اندر معنی کا سمندر لیے ہوئے ہے۔ پوری غزل قابل تعریف ہے۔

طاہرہ فرحت کی نظم کے پہلے دو اشعار کے بعد پانچوں مصرعہ تنہا ہے۔ اس کا دوسرا مصرعہ ہو سکتا ہے چھپنے سے رہ گیا ہو یا پھر لکھنے سے۔ مجموعی طور پر امید افزا پیغام ہے اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ (☆ یہ نظم معرّیٰ ہے یعنی اشعار نہیں مصرعے)

فریدہ خانم کی پہلی غزل کا پہلا مصرعہ بہت غضب کا ہے کیا تشبیہ اور استعارہ ہے۔ دوسری غزل بہت خوبصورت بحر میں ہے ہر شعر بہت پر اثر ہے پہلا مصرعہ

''وقت کی سکندر ہوں'' کیا خوب مضمون باندھا ہے اور یہ شعر بہت گہرائی لیے ہوئے ہے

''تم خوشی کے ساحل ہو غم کا میں سمندر ہوں''

خوشی اور غم کا حسین امتزاج ہے بہت خوب!

مدیرہ صاحبہ میں اس بات پر بہت خوش ہوں کہ خواتین بھی شاعری کے میدان میں لوہا منوا رہی ہیں۔ کیا نظم، کیا غزل، ہر میدان کی شہ سوار بن گئی ہیں۔ ادارت کی بھی نظرِ انتخاب کی داد دینا پڑے گی کہ ہر صنف کو مقررہ معیار کی چھلنیوں سے گزارنے کا فن رب نے عطا فرمایا ہے۔ اللہ تمام سعی و جہد کو للّٰہیت عطا فرمائے اور قبول کر لے (آمین)

حصہ نثر افسانوں کا آغاز ایک بہت ہی اچھوتے اور دل

کی تاروں کو چھونے والے عنوان سے ہوا ہے۔ نصرت یوسف نے بہت خوبصورت عنوان دیا ہے۔ افسانہ مجموعی طور پر بہت حسین طریقہ سے رہنمائی کر رہا ہے۔ یہ ادب کا خاصہ ہے (☆ عنوان کے لیے شکریہ!)

راشدہ سعید نے ایک خالی دامن عورت کے انجام کا نقشہ کھینچا ہے وہ ہم سب کو سبق دینے کے لیے کافی ہے کاش! دنیا کی رنگینیوں میں ڈوبنے سے پہلے ہم سمجھ جائیں اور اپنی عاقبت کو فراموش نہ کر بیٹھیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ''آنکھ کُھلتی ہی نہیں جب تک کہ بند نہیں ہوتی''۔

سارہ اسمٰعیل کا اعتراف بھی بڑی جرأت کا کام ہے۔ وقت پر توبہ کر لینا برائیوں کو نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔ خطا کو تسلیم کرنا اعلیٰ ظرفی ہے اور عاجزی میں عظمت پوشیدہ ہے۔

ام ایمان کی ''واپسی'' بہت ایمان افروز ہے۔ عقیدہ کی پختگی، عمل کی گواہی اور والدین کی صحیح تربیت کی وجہ سے رب کی پہچان اور شریانوں میں دوڑنے والا مومنہ کا خون اور غذائیت پہنچانے والا ماں کا دودھ عقیدہ و ایمان بھی پیدا کرتا ہے۔ جیت ہمیشہ حق کی ہوتی ہے سچے اور کھرے مومن کو کسی کا خوف نہیں ہوتا۔

آسیہ راشد نے ماشاء اللہ بہت مستقل مزاجی سے بہت اچھا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ حضرت لیا (زوجہ حضرت ایوب ؑ) کے بارے میں پہلی دفعہ حقائق نظر سے گزرے۔ علم اور قوتِ محرکہ میں بہت اضافہ ہوا ہے کیونکہ آزمائشوں میں سے ہم بھی گزرتے ہی رہتے ہیں۔ سیرت کے عنوانات پر مبنی ایسی تحریریں جذبۂ عمل کو جلا بخشتی ہیں۔ آسیہ سے درخواست ہے کہ مجھے اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔

سفر سعادت کے تحت زہرا نہالہ نے بھی کچھ ایسے گوشے وا کیے ہیں جو شاید ان کی نظر سے پہلے نہیں گزرے جن کا انھوں نے اظہار بھی کیا ہے ورنہ بہت سی کتب اور سفرناموں میں ان چیزوں کی نشان دہی ملتی ہے۔

قانتہ رابعہ کے ساتھ جیسا ہوا ایسا اکثر ہو جاتا ہے اور اسے میں اسلامی ٹیلی پیتھی کہتی ہوں۔ دل میں خواہش ہوتی ہے اور اللہ اپنے فرستادوں سے وہ کام کروا دیتا ہے اور اللہ تو خود ہی کافی ہے۔ وہ کن کہتا ہے اور فیکون (ہو جاتا ہے) یہ دلوں کے معاملات ہیں اور جب بنیاد اللہ اور رسول ؐ کی محبت ہو خلوص اور للّٰہیت ہو اور باہمی محبت بھی صرف اُن دوستوں کے لیے ہو تو پھر ایسا ہی ہوتا ہے۔

فرزانہ کوثر رب نے خوب صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ نثر نگار، افسانہ نگار اور جہاں مناسب سمجھتی ہیں اشعار کی گرہ بھی باندھ دیتی ہیں اور اس میں موصوف و مذکور کو ایسا باندھتی ہیں کہ چھوٹے نہ چھٹے۔ ایسے ظالموں کو کل دیکھیں گے کہ کیسے چھوٹتے ہیں۔

روبینہ عاطف کا ''ہلکا پھلکا'' بھی لطف دے گیا۔ گرچہ ذمہ دار یا قصوروار کہہ لیں ہم ہی ٹھہرے ہیں۔ بس یوں سمجھ لیں کہ مرکز و محور عورت ہی کی ذات ہے۔ اصل ذمہ دار تو یہی ہے نا تہذیب کو بنانے اور بگاڑنے والی۔ صلہ بھی تین گنا اسی کے حصہ میں آیا ہے۔ تو پھر بہنو! غم کس بات کا! ذمہ داری ادا کرتے جائیں اور سارے وار سہتے جائیں خوشخبریاں منتظر ہیں۔

''خفتگانِ خاک'' نے کیا کیا یاد کرا دیا۔ یہ درسِ فنا ہے اور نام تو اسی کا باقی ہے جس نے حسنات کما لیے۔ کچھ صدقہ جاریہ چھوڑا۔ یادیں باتیں تو بہت ہوتی ہیں۔ دوسروں کے

لیے مشعل راہ کچھ ہے تو غنیمت ہے۔ زادِراہ ہے گواہیاں ہیں تو نجات کی امید ہے۔ جانے والوں کے حالات پڑھ کر عمل کے طریقے متعین کر لیے تو فائدہ ہے ورنہ سارے سرمائے کا ضیاع ہے اللہ اس خسرانِ عظیم سے بچائے۔

امیر بی بی کی نظم ''چہرے نہیں سماج کو بدلو'' حلقہ خواتین کی ایک مہم کا عنوان تھا۔ اچھی کوشش ہے اس طرح مصرعہ پر میں نے بھی ایک نظم لکھی تھی آپ کہیں تو بھیجوں! (☆ عنایت ہو!)

دل چاہتا ہے کہ شمیم فاطمہ سے پوچھوں کہ آپ اتنا اچھا انشائیہ کیسے لکھ لیتی ہیں۔ بات کہاں سے شروع کر کے کہاں پہنچا دیتی ہیں۔ یہ کمال بھی رب کا عطا کردہ ہے۔ ادارے سے میں تو یہ بھی کہوں گی کہ کبھی کبھی بتول کی نظر اتار دیا کریں۔

حسن معاشرت کے عنوان سے ڈاکٹر شگفتہ نقوی نے بہت مختصر اور مدلل اخلاقی اصول بیان کیے ہیں جن پر عمل کرنے سے ہماری معاشرتی زندگی مسائل سے بچ سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے۔

شہود ہاشمی ''ہر گلی کوچہ میں بازار لہو گرم ہوا'' کے تحت اپنے احساسات لے کر محفل بتول میں آئے ہیں۔ فرقہ واریت، تعصب، لسانی، علاقائی، قومی، گروہی اختلافات نے مسلم امہ کو پارہ پارہ کر دیا ہے اس کا واحد علاج اللہ کی رسی کو مل کر پکڑنے میں ہے اور وہ بھی مضبوطی کے ساتھ۔ پھر ہی ہم کھویا ہوا وقار اور عظمت حاصل کر سکتے ہیں۔

ادارہ کی طرف سے دیا گیا ''غذا اور صحت'' کے عنوان سے مضمون ''امراضِ قلب سے بچاؤ'' پر تبصرہ بہت معذرت کے ساتھ حاضر خدمت ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ایک ہندو ڈاکٹر کی طرف سے دی گئی معلومات کی بجائے اگر کسی مسلمان ڈاکٹر کی طرف سے دی گئی معلومات یا کسی دل کے امراض کے ماہر ڈاکٹر کا انٹرویو رسالے میں آتا تو زیادہ خوشی کی بات ہوتی۔ آئندہ بھی اگر یہ سلسلہ شروع کر لیا جائے تو مفید رہے گا اگر ادارہ اجازت دے تو کیا میں اس کوشش میں پہل کی جسارت کر سکتی ہوں۔ (☆ نہایت ادب سے عرض ہے کہ نبیؐ کے فرمان کے مطابق حکمت مومن کی گم گشتہ متاع ہے۔ جہاں سے بھی ملے!)

رسالے کا اختتام (تقریباً..... کیونکہ محشر خیال باقی ہے) بشریٰ تسنیم کی تحریر سے ہو رہا ہے۔ موصوفہ نے بہت محنت اور استقامت سے اپنا ایک مقام بنایا تا آنکہ ایک گوشہ اپنے نام مختص کروالیا یہ بہت بڑی کامیابی ہے جس کا سارا کریڈٹ اللہ تبارک وتعالیٰ کو جاتا ہے۔ حب الٰہی اور حب رسولؐ کا صلہ تو پھر دنیا میں بھی مل ہی جاتا ہے۔ اچھوتی اور مختصر تحریریں بہت گہرے فکر و عمل کے لیے اثرات چھوڑ جاتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے پوری زندگی کانٹوں پر چلنا پڑتا ہے کوئی لہو رنگ ہوگا تو آہ میں اثر ہوگا۔

محشر خیال میں زیب اسد نے بھی بہت اہم اور نازک موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ تصویر کے دونوں رخ ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ ترازو لے کر ناپ تول کر کے لین دین کرنا علم والوں کا شیوہ نہیں ہوتا۔ اللہ بھی احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

مدیرہ صاحبہ! تبصرہ کافی طویل ہو گیا بہرحال گزشتہ کی اسی طرح ہی تلافی ہو جائے۔ (☆ جزاک اللہ خیر! آپ کی محبت اور عنایت کے لیے تہہ دل سے مشکور ہوں، ص۔ا)

☆☆☆

فرزانہ چیمہ۔لاہور

نومبر کا بتول ملا۔اداریہ زبردست تھا، میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے.....کی تصویر وتفسیر۔

''اس واقعے کو جو اہمیت دی جارہی ہے اس کا تجزیہ ہونا خود واقعے سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔''

اس جامع فقرے پر لطف آ گیا، سوچنے کی بات ہے کہ جس کی صحت یابی کے لیے گرجا گھروں اور مندروں میں دعائیں کی جارہی ہیں تو وہ مریضہ کن لوگوں، کس مکتبۂ فکر اور کس مذہب کے لوگوں میں سمائی بیٹھی ہے۔اللہ کا شکر ہے غیروں کی یہ سازش بھی طشت از بام ہوگئی اور وہ اپنے مقاصد حاصل نہ کر سکے **واللّٰہ خیر الماکرین**.....ویسے اداریہ اگر کسی ایک اہم مسئلہ پر ہی بھرپور اور تفصیل سے ہوا کرے تو قارئین زیادہ دیرپا اثر قبول کر سکتے ہیں بجائے اس کے کہ تین چار خبروں پر تجزیہ وتبصرہ کرتے ہوئے آگے بڑھ جائیں۔

نصرت یوسف کا افسانہ بہت اچھا لگا .....ہمیں اپنی سوچیں مثبت اور کارکردگی ایک مسلمان کے شایانِ شان رکھنی چاہیے۔اس میں مشکل تو کچھ بھی نہیں۔''مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ'' والی بات ہے اور آج کی ماں شاید محنت کرنا نہیں چاہتی۔البتہ عنوان کچھ اور ہوتا تو بہتر تھا۔

روبینہ عاطف کا ''تماشا مرے آگے'' مزا دے گیا۔ خاص کر یہ جملہ تو حاصل مضمون لگا ''حد ہوگئی، ہم جوان تھے تو اپنے والدین سے ڈرتے تھے، اب ہم والدین ہیں تو اپنے بچوں سے ڈرتے ہیں یعنی ہر طرف سے ہم ہی پسے جارہے ہیں۔''

شہود ہاشمی شاعری کی دنیا سے نکل کر اب نثر کی طرف آئے ہیں۔ہر سنجیدہ فہمیدہ پاکستانی کے دل کی آواز ہے ان کا مضمون۔مگر کیا کریں دعا ہی کر سکتے ہیں اور دعا انھوں نے بڑی کی ہے۔قبولیت بخشے رب رحمان ورحیم۔

شمیم فاطمہ کا انشائیہ حسب معمول خوب ہے مگر خطوطِ وحدانی کا استعمال کچھ زیادہ ہی کرتی ہیں اور پھر بہت طویل یہ ان کے تحریری حسن میں ایک رکاوٹ سی محسوس ہوتی ہے۔

بشریٰ تسنیم بہت اچھا لکھتی ہیں مگر فہرست میں 'گوشۂ تسنیم' کے عنوان کی سمجھ نہیں آئی۔بعض اوقات ان کا افسانہ الگ ہوتا ہے اور گوشۂ تسنیم میں کوئی اور تحریر۔گوشہ میں تو ایک مصنف کی تمام تحریریں ہوتی ہیں یا پھر اس کا کوئی معنی ہے۔ اگر مدیرہ شروع میں ایک مختصر سا نوٹ لگا دیتیں تو وضاحت ہوجاتی۔

آسیہ راشد کا نامور خواتین سے متعارف کروانا محدود مطالعہ کرنے والوں کے لیے ایک نعمت ہے اور کثیر مطالعہ کرنے والوں کے لیے قند مکرر۔اب انار کے فوائد سے بھی آگاہ کیا ہے۔بہت شکریہ آسیہ!

زہرہ نہالہ کا سفرِ سعادت نہال کر گیا۔اور ہاں! سب سے اہم مضمون تو رہ جاتا ہے۔ڈاکٹر آسیہ شبیر کا قابل قدر اور قابل عمل مضمون ''تدریس قرآن مجید کے تقاضے'' ہمارے دل کی آواز ہے۔ہمیں بھی بعض اوقات یہی محسوس ہوتا ہے کہ مسند دعوت و ارشاد کے لیے ہر کوئی اہل نہیں ہوتا۔اس کے لیے علم اور عمل دونوں گیرائی وگہرائی کی حد تک ضروری ہوتے ہیں۔

محشر خیال مختصر ہوتا جارہا ہے اور کبھی بالکل ہی غائب.....

قارئین اب اتنے بھی آرام پسند نہ بنیں .....خواتین اس بات کو زیادہ جانتی ہیں کہ جب کبھی محنت سے کھانا پکا کر پیش کیا جائے اور کھانے والے چپکے سے کھا کر اٹھ جائیں تو خاتونِ خانہ کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ ارے بھئی کوئی تبصرہ، کوئی چھوٹا سا ستائشی جملہ پکانے والے کی تھکن اتار دیتا ہے۔ ایسا ہی حال تحریروں پر چپ سادھ لینے پر ہوتا ہے۔ اتنی محنت سے ہر ماہ ادارتی ٹیم آپ کے لیے ''بتول'' مرتب کر کے آپ کے حضور پیش کرتی ہے وہ بھی اتنے سستے داموں مگر آپ ہیں کہ بتاتے ہی نہیں کیسا لگا؟ بس اس قلت محشر خیال کے تحت ہی آج اتنا طویل تبصرہ کر دیا ہے.....اللہ ہم اور آپ کو خوب صورت سوچنے .....خوب صورت لکھنے اور پھر تبصرہ کرنے کی توفیق دے آمین۔

☆☆☆

اسامہ ربانی۔ چارسدہ

''چمن بتول''، ہمیشہ کی طرح خوب جا رہا ہے۔ خاص کر اس کے حُسن ترتیب نے مجھے مسحور کر رکھا ہے۔ تمام مضامین، افسانے، نظمیں، کالم اپنی مثال آپ ہیں۔ بظاہر ہے تو خواتین کا رسالہ مگر عملاً خواتین وحضرات دونوں کے لئے یکساں مفید ہے۔

پہلے پہل پھوپھی صاحبہ نے ممبر شپ کرائی تھی اور رسالہ باقاعدگی سے آتا تھا مگر 2010ء کے سیلاب سے جہاں پانی آیا وہاں خود بخود رسالہ آنا بند ہو گیا۔ اس سال فروری میں اپنے نام رسالہ جاری کیا مگر تا حال صرف چار شمارے ملے ہیں۔ دعا ہے کہ باقاعدگی سے ملا کرے۔

☆☆☆

ڈاکٹر بشریٰ تسنیم

# شاپنگ لسٹ

شاپنگ کا مزہ تو اسی میں ہے کہ کم سے کم قیمت دے کر بہترین چیز حاصل کی جائے!

ہر گھر میں ہر فرد اپنی ضروریات کے مطابق شاپنگ لسٹ بناتا ہے۔ بازار، دکانیں، شاپنگ مال، ہر مقام پہ لوگ اپنی اپنی پسند، معیار اور وسائل کے مطابق شاپنگ کرتے نظر آتے ہیں۔ جن کے پاس وسائل کم ہیں وہ ''ونڈو شاپنگ'' سے دل بہلاتے اور آہیں بھرتے نظر آتے ہیں۔ آنکھوں میں حسرت اور دلوں میں رنج اور اداسی کے ڈیرے ہیں۔

بیرون ملک جا کر اپنے وطن میں گھر بنانے کا منصوبہ ہر پردیسی کا خواب ہوتا ہے۔ پلاٹ لے لیا ہے۔ اب نقشہ بن گیا ہے، تعمیر شروع ہے۔ تعمیری سامان کی فراہمی کے لیے شاپنگ ہے۔ ساری زندگی کا محور وہ گھر ہے جو دیس میں بن رہا ہے۔ پردیس میں خانہ بدوشی کی زندگی ہے۔ دیس میں آرام سے سکون سے رہنے کے لیے دن رات صبح و شام منصوبہ بندی ہے۔

گھر بن گیا۔ اب اس کی تزئین و آرائش کی شاپنگ ہے۔ اس گھر کے شایان شان ساز و سامان کی خریداری ہے۔

ہم آج کے دور کو شاپنگ کلچر کا دور کہہ سکتے ہیں۔ زیور، کپڑے، پھر لباس کے لوازمات، میچنگ اشیاء۔ ایک چیز کے ساتھ ایک اور بڑھتی جاتی ہے۔ کبھی شاپنگ کا بھوت خواتین کے سر پر سوار ہوتا تھا..... اب ہر فرد، ہر عمر میں اس دوڑ میں شامل ہو گیا ہے۔ اب ہر روز ایسی گہما گہمی نظر آتی ہے جو کبھی تہواروں پہ نظر آتی تھی۔ ہر انسان مہنگائی کا رونا روتا ہے مگر خریداری کا رجحان کم نہیں ہوتا نظر آتا۔

انتظار کا مادہ ختم ہوتا جا رہا ہے جیسے عدم برداشت کا رویہ بڑھ رہا ہے۔ خواہشوں کے پورا ہونے میں دیر نہ ہو ..... محنت کے بغیر مل جائے۔ بس دولت ہو اور پھر من کی خواہش پوری ہو جائے ..... شاپنگ کے لیے نکلنا ایک طرح سے اب نشہ بنتا جا رہا ہے۔ مسائل کے حل کے لیے اک نیا مسئلہ وبالِ جان بنا ہوا ہے۔ بازار تو بجائے خود بہت سے مسائل کی جڑ ہے۔ بازار میں خرید و فروخت ہو رہی ہے، ساتھ بہت کچھ ''مزید'' بھی لیا دیا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان واقعی ہر لمحہ کچھ نہ کچھ شاپنگ کرتا رہتا ہے۔ سودا چکایا جا رہا ہے کچھ دے کر کچھ خریدا جا رہا ہے۔

دنیا دے کر دنیا ہی خریدی جا رہی ہے..... دولت خرچ کر کے کسی اور قسم کی دولت ہی حاصل کی جا رہی ہے۔ ہر کسی کا کوئی نہ کوئی خواب ہے جس کو پورا کرنے کے لیے دولت کمائی جا رہی ہے اور خرچ کی جا رہی ہے۔ انسان اپنے ہی جیسے انسان کے ساتھ خرید و فروخت کر رہا ہے۔

کیا یہ نفع کا سودا ہے کہ فانی چیز کے بدلے فانی چیز ہی حاصل کی جائے؟ شاپنگ کا مزہ تو یہ ہے کہ کم تر چیز قربان

کر کے بہتر چیز حاصل کی جائے .....

کیا کوئی ایسا بازار، شاپنگ مال ہے جہاں انسان کسی بڑی بہت اعلیٰ ہستی کے ساتھ خرید و فروخت کرے جو فانی مال لے کر غیر فانی ابدی مال عطا کرے۔ جی ہاں ایسی بھی شاپنگ ہے وہ بھی ہر لمحہ کی جاسکتی ہے۔ ہر روز کی جاسکتی ہے، ہر جگہ کی جاسکتی ہے، گھر بیٹھے کی جاسکتی ہے۔ اب تو آن لائن شاپنگ کا کلچر بھی رواج پا رہا ہے۔ تو یہ شاپنگ آن لائن سے بھی زیادہ آرام دہ ہے۔ اس میں خیانت کا کوئی خطرہ نہیں کہ ''امین'' ہستی سے معاملہ ہے۔ مال کے گھٹیا ہونے کی فکر نہیں۔ معاہدے سے پھر جانے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ کوالٹی کی گارنٹی ہے۔ نفع اور بھرپور نفع کا یقین ہے۔

ہمیں جب بھی شاپنگ کا خیال آئے تو خیال کریں کہ کون سا سودا بہترین ہے؟

ایک گھر دنیا کا ہے تو آخرت میں بھی ایک گھر بنانا ہے۔ وہاں بھی سامان چاہیے۔ وہ سامان یہیں سے آرڈر ہو گا..... اسی دنیا کے راستے سے وہاں ضرورت کی ہر چیز پہنچائی جائے گی۔ کیونکہ اس راستے سے گزرے بغیر وہاں جانا ممکن ہی نہیں۔

یہاں کی خریداری یہیں رہ جائے گی جو وہاں کے لیے شاپنگ ہوگی وہ باقی رہ جائے گی۔ دنیا کی شاپنگ بوسیدہ ہو جائے گی۔ آخرت کی شاپنگ کو خطرہ نہیں حیاتِ مستعار کا کتنا حصہ خرچ ہو چکا۔ اس حیات سے کیا کیا خریدا جا چکا؟ اب کتنا سرمایہ رہ گیا اس سے کیا خریدنا ہے؟

ہم دنیا میں رہ کر ہی آخرت کے لیے شاپنگ کر سکتے ہیں۔ جیسے ہی دنیا سے رخصتی ہوئی یہ شاپنگ کی کلی مہلت ختم ہو جائے گی۔ مختلف ادارے وقتاً فوقتاً اپنے اپنے تیار شدہ مال کی اشتہاری مہم چلاتے ہیں۔ طرح طرح سے لوگوں کو متوجہ کرتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں نکلنے والے بھی اللہ تعالیٰ کے پاس جو پراڈکٹس ہیں ان کی نمائش لگاتے رہتے ہیں اور قرآن ہمیں جگہ جگہ ان چیزوں کی طرف متوجہ کرتا ہے جو خریدنی چاہئیں جن کی شاپنگ کے منصوبے بنانے چاہئیں۔ جن پہ سرمایہ وقت، عمر اور دولت خرچ کرنا چاہیے۔ روزانہ کوئی ایک اینٹ، کوئی پتھر..... کسی قسم کا کوئی ایک ذرہ وہاں کے گھر کی تعمیر کے لیے بھی خریدا جا سکے۔ کوئی کھڑکی، کوئی کواڑ ..... وہاں کے لیے بھی پسند آجائے۔ وہاں کے لان کے لیے کوئی درخت، کوئی پھول، کوئی پتہ خریدنا بھی ہمارے دن کے کسی حصے میں ضروری سمجھا جاتا ہو ..... زیور، کپڑوں کی خریداری میں وہاں کے لباس کی خریداری بھی چونکا دیتی ہو ..... ہماری شاپنگ لسٹ میں وہاں کے سامان بھی لکھے جاتے ہوں۔ جب کسی منصوبے پہ عمل کرنا ہو تو سارے وسائل، عقل و فہم مانع لے آتی ہے..... ضروری اور غیر ضروری کی لسٹیں بن جاتی ہیں۔ کیا کیا پابندیاں لگا کر کیا مستقبل بن سکتا ہے سب سوجھ جاتا ہے۔ فیصلہ انسان کے ارادہ و اختیار کے ہاتھ میں دے دیا گیا کہ یہی جان و مال کا سرمایہ ہے اس سے دنیا کی شاپنگ کر لو یا پھر آخرت میں جنت حاصل کرنے کے لیے کچھ خرید لو اور اسی دنیا کے میلے سے کچھ انوکھی شاپنگ کر کے اپنا وہ محل (جنت) سجا لو، جس کا سودا تو ہو ہی چکا ہے۔ اب یہ سودا قائم رکھنا ہے یا نہیں؟

بڑے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو دنیا کو آخرت کے

لیے استعمال کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ حاصل کرنے کو
سب سے اچھا برانڈ اللہ کا ہے اس کو پانے کے لیے
''برانڈڈ'' نیکی کی ضرورت ہے۔ بہت بدنصیب ہیں وہ جو
دنیا دے کر دنیا ہی خرید پاتے ہیں۔ وہ دنیا جس کا کوئی برانڈ
نہیں، کوئی قیمت نہیں۔ مچھر کے پر سے بھی زیادہ حقیر برانڈ
ہے دنیا کا اللہ کی نظر میں۔

☆☆☆